toobaa-elibrary.blogspot.com

باقیاتِ فتاویٰ رشیدیہ

محدث دوراں، افقہ زماں حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ

کے

ایسے تقریباً ایک ہزار فتاویٰ کا مجموعہ جو فتاویٰ رشیدیہ
میں شامل نہیں اور ابتک غیر مطبوعہ یا ناپید تھے

تلاش، جمع و ترتیب اور حواشی

نور الحسن راشد کاندھلوی

ناشر
حضرت مفتی الٰہی بخش اکیڈمی
کاندھلہ ضلع پربدھ نگر (مظفر نگر) یوپی، انڈیا

toobaa-elibrary.blogspot.com

باقیات فتاویٰ رشیدیہ

محدث دوراں، فقیہ زماں حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ

کے ایسے تقریباً ایک ہزار فتاوی کا مجموعہ جو فتاوی رشیدیہ
میں شامل نہیں اور ابتک غیر مطبوعہ یا ناپید تھے

تلاش، جمع و ترتیب اور حواشی

نور الحسن راشد کاندھلوی

ناشر
حضرت مفتی الٰہی بخش اکیڈمی
کاندھلہ ضلع پربدھ نگر (مظفر نگر) یوپی، انڈیا

toobaa-elibrary.blogspot.com

باقیات فتاویٰ رشیدیہ

محدث دوراں، افقہ زماں حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے
تقریباً ایک ہزار ایسے فتاویٰ کا مجموعہ
جو فتاویٰ رشیدیہ میں شامل نہیں اور چند کے علاوہ تمام غیر مطبوعہ اور نہایت
نادر و کم یاب تھے

جمع و ترتیب حواشی اور مقدمہ

نور الحسن راشد کاندھلوی

مزید حواشی وافادات

حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری دام ظلہ

شیخ الحدیث و صدر المدرسین، دار العلوم دیوبند

ناشر

حضرت مفتی الٰہی بخش اکیڈمی

کاندھلہ، ضلع پربدھ نگر (مظفر نگر) یوپی - انڈیا

toobaa-elibrary.blogspot.com

حضرت مولانا گنگوہی کا ایک مشہور تاریخی فتویٰ

ہندوستان کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

فتوائے دارالحرب

اس فتوے کا پس منظر، اس کے محرکات، اس سوال کرنے والے، اس فتوے کے قلمی نسخے، بعض پرانی طباعتیں اور ان کے متعلقات۔ نیز مکمل فتویٰ کا قدیم اور صحیح ترین متن، فتویٰ کا مفصل سوالنامہ، جو اس تحریر کا محرک بنا تھا۔

مفصل مقدمہ، پس منظر و پیش منظر، اصل فارسی متن اور فتوے کا اردو ترجمہ

ترتیب و تحقیق اور حواشی و تصحیح

نور الحسن راشد کاندھلوی

toobaa-elibrary.blogspot.com

حضرت مولانا گنگوہی کا تاریخی فتویٰ

[ہندوستان کی شرعی حیثیت کیا ہے......؟]

پس منظر، محرکات، اس فتوے کے مستفتی، قلمی نسخے، طباعتیں متعلقات

نیز اس موضوع پر حضرت مولانا گنگوہیؒ کے اور فتاویٰ

ہندوستان کی شرعی حیثیت کیا ہے، اس کو فقہائے اسلام کی اصطلاح میں دارالاسلام کہا جائے گا یا دارالحرب، یا ایک نسبۃً متاخر اصطلاح کے مطابق دارالامن! اس کے دارالاسلام سے دارالحرب تک اور دارالحرب سے دور حاضر کی روایات تک پہنچنے میں، کیا حالات و محرکات کارفرما ہے اور کس کس دور میں کون کونسے علماء نے کیا رائے ظاہر فرمائی۔ نیز حضرت مولانا گنگوہی کے، اس موضوع پر مشہور فتوے اور رائے کا پس منظر کیا ہے، اس اہم فتوے کے محرک کون صاحب ہوئے تھے، اس فتوے اور اس موضوع پر، حضرت مولانا گنگوہی کی بعض اور تحریرات میں کیا مناسبت و اختلاف ہے، اس سے واقفیت کے لئے، چند معروضات ضروری ہیں۔

برصغیر ہند میں اسلامی حکومت کا قیام: برصغیر ہند میں پہلی اسلامی حکومت محمد بن قاسم (۱) کی فتوحات کے نتیجہ میں قائم ہوئی تھی، جس کی حدود دریائے سندھ کے کناروں یا پنجاب کے بعض سرحدی علاقوں تک محدود تھیں۔ چوتھی صدی ہجری کے آخر اور پانچویں صدی کے آغاز میں، محمود غزنوی کی ملک گیر فتوحات سے اس کا دائرہ وسیع ہوتا ہوا، برصغیر کے اکثر حصوں تک جا پہنچا، مگر اس کے نتیجہ میں برصغیر میں باقاعدہ مسلم حکومت یا ایسا نظام مملکت قائم نہیں ہو سکا تھا، جس کو باقاعدہ حکومت یا اسلامی نظام کہا جا سکے۔ سلطان شہاب الدین محمد غوری پہلے حکمراں ہیں، جن کی تراوڑی (کرنال، ہریانہ) کے میدان میں تاریخ ساز جنگ اور فتوحات سے، اس ملک میں اسلامی مملکت اور نظام حکومت کی بنیاد استوار ہوئی، غوری کے مفتوحہ علاقہ کو، غوری کے برگزیدہ نمائندے [قطب الدین] ایبک نے بہت شان اور وقار کے ساتھ سنبھالا اور غوری کی قائم مقامی کا فرض پوری طرح ادا کیا، غوری کی ملحدین کے ہاتھوں (۱۷ر ذی قعدہ ۶۰۲ھ ۲۵ر جون ۱۲۰۶ء) کو شہادت کے بعد ایک باقاعدہ تخت نشین ہوا، اس وقت سے برصغیر میں مسلم حکومتوں کا جو آغاز ہوا تھا، وہ مختلف قسم کے حالات،

(۱) مشہور ہے کہ سندھ میں قیادت کے وقت محمد بن قاسم صرف سترہ سال کے تھے مگر یہ روایت و اطلاع صحیح نہیں، محمد بن قاسم سنہ ۶۲ھ (۶۸۱ء) میں تولد ہوئے سندھ سنہ ۹۳ھ میں فتح ہوا، اس طرح فتح سندھ کے وقت محمد بن قاسم کی عمر تقریباً اکتیس سال ہونی چاہئے۔

toobaa-elibrary.blogspot.com

جنگوں، بغاوتوں، خاندانوں اور اختلافات سے گذرتا ہوا، اس وقت تک جاری رہا، جب قلعۂ معلی دہلی کے آخری برائے نام حکمراں، بہادر شاہ ظفر انگریزوں کے ہاتھوں گرفتار کر لیے گئے اور تخت دہلی کا نام ونشان مٹ گیا۔

ترا وڑی کی جنگ (۵۸۸ھ/۱۱۹۲ء) سے بہادر شاہ ظفر کی برخواستگی (۱۲۷۴ھ/۱۸۵۷ء) تک تقریباً سات سو سالہ مسلم دور حکومت میں، تقریباً ستاون افراد سریر آرائے حکومت ہوئے، جس میں مشکل سے چھ یا سات حکمراں ایسے تھے، کہ جن کو دین اسلام اور قانون شریعت کی بالادستی کا خیال تھا، انہوں نے باضابطہ اسلامی نظام حکومت قائم ونافذ کرنے کی کوشش کی تھی اور اسلام کے طریقہ حکمرانی اور عدالت وانتظام میں، اسلامی اصولوں کو بہر صورت کارفرما کرنے کے، احکامات جاری کیے تھے۔ ان کے علاوہ اکثر حکمراں، صرف رسمی طور پر مسلمان اور ایسی حکومتوں کے سربراہ تھے، جن کو مسلم حکومت کہا جاتا تھا، ان کو نہ اسلام عزیز تھا، نہ اس کا نظام عدل وانصاف پسند تھا، وہ صرف اپنی حکومت اور اختیارات کے طالب وجویاں تھے، اس میں اسلام اور قوانین اسلام کی، کیسی ہی خلاف ورزی اور مخالفت ہو، ان کو اس کا بہت کم احساس ہوتا تھا، مگر اس لمبے عرصہ میں، غالباً کبھی اس پر واضح بحث وگفتگو نہیں ہوئی، کہ آج کل فلاں شخص نظام حکومت پر مسلط ہے، اس کے جاری کیے ہوئے قوانین وضوابط، دین شریعت کی اساس پر نہیں ہیں، وہ خود بھی اسلامی قوانین واصول کی پابندی نہیں کرتا، نہ ان کو پسند کرتا ہے، نہ ہی اس کا ان کے مطابق قانون ونظام نافذ کرنے کا خیال ہے، اس وجہ سے اب یہ ملک دارالاسلام نہیں رہا، ایسے حالات میں اس ملک کو صرف دارالامن یا مسلم مملکت کہا جا سکتا ہے، دارالاسلام نہیں، کیوں کہ یہاں اسلام بالادست قوت کی حیثیت سے کارفرما نہیں ہے۔

صرف خسرو خاں کا مختصر زمانۂ اقتدار اور اکبر(۱) کا آخری دور، کہنا چاہئے ہندوستان کے مسلم دور حکومت میں، اس پہلو سے مستثنیٰ ہے کہ اس پر اسی زمانہ میں سخت تبصرے ہوئے، اور اس دور کے اہل قلم اور مؤرخین نے صاف لکھ دیا، کہ ان کی حکومت

---

(۱) یہ دونوں حکمراں جو بظاہر اول اول مسلمان تھے مگر بعد میں اسلام کے بڑے دشمن نکلے۔ خسرو خاں اپنے آقا اور محسن علاؤالدین مبارک شاہ کو قتل کر کے، جمادی الاخری ۷۲۰ھ کی پہلی تاریخ (۹ر جولائی ۱۳۲۰ء) کو حکومت پر قابض ہوا تھا، اس نے اسلام اور مسلمانوں کی بے آبروی میں کوئی کمی نہیں چھوڑی۔ اس کے مختصر دور حکومت میں دہلی اور اطراف دہلی میں اسلام اور مسلمانوں سے زیادہ بے وقعت کوئی نہیں تھا۔ ضیاء الدین برنی نے اس وقت کی تفصیلات کا ذکر کرتے ہوئے بہت درد کے ساتھ لکھا ہے: "باز دہلی ہندوانہ شد و مسلمانی رفع و مضمحل گردد" (۴۱۲) تاریخ فیروز شاہی

خسرو خاں نے اپنے اس نظریہ اور خاص دشمنانہ رویہ کے باوجود اپنے لئے ناصر الدین کا لقب اختیار کیا تھا، اس پر اس دور کے ممتاز شاعر عصامی نے جو شعر کہا ہے وہ "تمام ہندگی کافور" کی عمدہ مثال ہے۔ یہ شعر خلیق احمد نظامی صاحب نے سلاطین ہند کے مذہبی رجحانات میں (ص ۲۰۵ دہلی) نقل کیا ہے، ملاحظہ ہو:

شدہ ناصر دیں چہ ضدش لقب
کہ بودہ است در قمع دیں روز وشب

اکبر نے بھی اپنی اختراع، دین الٰہی کے لئے اسلام کے ارکان اور اعمال وآثار کا نشان مٹا دینا ضروری سمجھا تھا۔ اس کی تفصیلات ملا عبد القادر بدایونی وغیرہ مؤرخین نے ذکر کی ہیں۔ بعد کے مؤرخین بھی بدایونی کی تصریحات سے اتفاق کرتے ہیں۔ تفصیلات کے لئے دیکھئے: "دین الٰہی اور اس کا پس منظر" پروفیسر محمد اسلم، وغیرہ۔

اور حرکات سراسر اسلام دشمنی پر مبنی اور عملاً غیر اسلامی حکومتیں ہیں، ان دونوں کے عہد میں اہل اسلام اور مذہب اسلام دونوں پر، جو برا وقت آیا تھا وہ عالم آشکارا، اور ہماری تاریخ کا ایک ایسا المناک باب ہے، جس کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

چراغ آخر شب، اورنگ زیب عالمگیر: اکبر کی موت کے بعد [خصوصاً حضرت مجدد الف ثانی کی کوششوں اور شیخ فرید بخاری کی دانش مندانہ حکمت عملی سے] مغل خاندان کے ارباب حکومت واقتدار کو، ہدایت نصیب ہوئی، انہوں نے ایک مرتبہ پھر ہندوستان کے پچھلے حکمرانوں اور اجداد کی روایت کے مطابق، اسلام سے وابستگی اختیار کی اور متعدد کمزوریوں اور خامیوں کے باوجود صراط مستقیم اور تعلیمات دین سے ایک حد تک وابستہ رہے۔ اس کیفیت کو عملی استحکام اس وقت حاصل ہوا، جب اورنگ زیب عالمگیر نے زمام سلطنت سنبھالی، اور اپنی مملکت میں نظام شریعت نافذ کرنے اور مملکت کو پوری طرح، اسلام کے راستے پر لانے کی تدبیر کی، ہر چند کہ اورنگ زیب کے دور میں یہ ملک گویا گہوارۂ اسلام بن گیا تھا، اور خود بادشاہ بھی اتنی بڑی مملکت وحکومت کا تاجدار ہونے کے باوجود، سادگی کا مرقع اور اسلامی احکام ونظام کا ایک نمونہ تھا، مگر اورنگ زیب کے تقریباً تیس سال تک، اپنے پایۂ تخت دہلی سے دور رہنے کے سبب، اس علاقہ پر اس کے وہ اثرات نہیں پڑے، جس کی توقع کی جا سکتی تھی۔

اورنگ زیب کے اخلاص، سادہ دینی مزاج وحکومت کے پورے اعتراف کے باوجود، اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں، کہ اگر اورنگ زیب نے ان ریاستوں کی بیخ کنی کرنے کے بجائے، دہلی اور اطراف دہلی میں اپنی حکومت کو مستحکم کیا ہوتا، دشمنوں سے حفاظت کی تدبیر کی ہوتی، ملک کو فوجی لحاظ سے ناقابل تسخیر بنانے کا اہتمام، اور مستقبل کی طویل منصوبہ بندی کی ہوتی، نیز اپنے خاندان اور اولاد کی صحیح تربیت پر توجہ کی ہوتی، تو اس کا فائدہ اس سے کہیں زیادہ اور دیرپا ہوتا، جو ان ریاستوں کو فتح کرنے سے ہوا۔

مغلیہ تخت سلطنت کے نااہل وارث اور ان کا عہد ابتلاء: اورنگ زیب کے دہلی سے مسلسل دور رہنے کی وجہ سے، اطراف دہلی اور شمالی ہندوستان میں موجود ان طاقتوں اور قوتوں کو پھر اکٹھے ہونے ابھرنے کا موقع مل گیا، جو طاقتور مسلم دور حکومت میں، بے دست وپا اور ناقابل تذکرہ ہوگئی تھیں، ان برادریوں اور گروہوں نے، شاید اورنگ زیب کی زندگی میں ہی اپنے ہتھیار تیز کرنے اور اپنے اپنے علاقوں سے، قدم باہر نکالنے کے ارادے کر لئے تھے۔ اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے بعد وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا، اورنگ زیب کے وارث، اپنے باپ کی صلاحیتوں سے عاری اور ان کمالات سے محروم تھے، جو اقتدار وجہاں بانی کا حرف آغاز ہوتی ہیں۔ حکومت وفرمانروائی کی تمام صلاحیتوں سے محرومی اور توقعات وخواہشات کی زیادتی نے ان کو ایسے اقدامات پر اکسایا، جو نہ صرف ان کی ذات، بلکہ اس خاندان کی حکمرانی کے لئے بد شگون اور زوال کا نشان ثابت ہوئے۔

toobaa-elibrary.blogspot.com

اورنگ زیب عالمگیر کی وفات (ذی قعدہ ۱۱۱۸ھ/فروری سنہ ۱۷۰۷ء) کے بعد، ان کے بیٹوں میں تخت نشینی اور وراثت کی جنگ، برادر کشی تک پہنچ گئی تھی، خاندان میں شدید اختلافات اور تفرقہ پیدا ہوا، مملکت کی آبرو اور تخت سلطنت کی عظمت ختم ہوئی اور ان لوگوں کو اپنی حسرتیں پورا کرنے کا موقع ہاتھ آگیا، جو خاندان مغلیہ کا زوال اور مسلم حکومت کی تباہی دیکھنا چاہتے تھے۔ یہ تمام افراد اپنے تیر وتفنگ لیکر میدان میں آئے تھے، جو زور آزمائی اور ظلم وستم کے بل پر، حکومت واقتدار کو بے بس کر دینا چاہتے تھے، ایسے تمام سازشیوں نے اپنے مقاصد حاصل کرنے کے لئے، مغل حکومت اور اس کے علاقوں پر حملے شروع کئے، اپنے علاقوں میں اپنے اپنے نیزوں کی تیزی آزمانے کے بعد، ان کا رخ دوسرے علاقوں کی مسلم آبادیوں اور بستیوں کی جانب ہوا، اور جن علاقوں، بستیوں میں ان کے سبز قدم پہنچے، وہاں وہاں سے انسانیت وشرافت شرمندہ ہوکر رخصت ہوگئی، ان کے حملوں اور شر پسندی کی وجہ سے، ہر مسلم بستی ایک مقتل میں تبدیل ہوگئی تھی، ہر محلہ سے خون کے فوارے بلند ہورہے تھے اور ہر اک گلی کوچہ میں موجود، خاکستر محلات ومکانات ظلم وبربریت کی ایک علیحدہ داستان سنا رہے تھے، برصغیر کے مسلمانوں نے اپنے گھروں، علاقوں میں لہو کی ایسی فروانی اور ابلیسیت کا ایسا عریاں رقص اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

یہ کسی ایک جماعت یا گروہ کے ظلم وتشدد کی بات نہیں تھی، بلکہ اس وقت موجود، کئی اسلام اور مسلم دشمن قوتوں اور گروہوں نے، ایک ہی انداز سے سوچا تھا، ایک ہی انداز سے اقدام کیا۔ یہ بے گناہ مسلمانوں کا خون بہانے، ان کے گھروں کو تاخت وتاراج کرنے کی، ایک لمبی بھیانک اسکیم تھی، جس نے شمالی ہند کے اکثر حصوں کو بے دریغ حملوں، لوٹ مار، قتل وغارت گری، ظلم وجبر، بربریت وسفاکی سے، جہنم کا نمونہ بنادیا تھا۔ اس وقت مغل حکومت بے بس تھی، اس کی طاقت مفقود، استحکام متزلزل تھا اور جاہ ومنزلت دور ماضی کی بات بن چکی تھی۔

حال یہ تھا کہ جس کا جی چاہتا دلی پر چڑھ دوڑتا، جو چاہتا اس کے اطراف میں لوٹ مار کرتا اور رخصت ہوجاتا، جو چاہتا خون مسلم کی ہولی کھیلتا، ان کی بے کسی کا تماشہ کرتا، ان کی آبروؤں کو پامال کرتا اور ان کو گرفتار کرکے لے جاتا۔ نہ کوئی اس مصیبت کا دور کرنے والا تھا، نہ ان طاقتوں کا مقابلہ کرنے والا۔ یہ ایسے حالات تھے جس میں صاف نظر آرہا تھا کہ اگر کوئی خاص بات پیش نہ آئی، اور ایسا مرد میدان سامنے نہ آیا جو ان ظالم، چیرہ دست قوتوں سے پنجہ آزمائی کرکے، ان کو بے دست وپا کرسکے، تو اس ملک میں اسلام اور مسلمانوں کا وجود خطرے میں ہے۔ اگر ان اسلام دشمن قوتوں کو تاخت وتاراج، قتل وخون ریزی اور خاک وخون کا مشغلہ جاری رکھنے کی، ایسی ہی آزادی رہتی ہے (جیسی اُس وقت تھی) تو اس ملک میں مسلمانوں کی آبرومندانہ زیست کا، تصور بھی باقی نہ رہے گا۔ جس ملک میں مسلمانوں کے لئے ایسے حالات ہوں، جہاں اہل ایمان کے لئے زندگی اور ترقی وکامرانی کے سب راستے بند اور تباہی وبربادی کی ہر قوت آزاد وبے مہار ہو، اس ملک اور علاقہ کو دار الحرب کے علاوہ اور کیا کہا جاسکتا ہے.....؟؟؟

حضرت شاہ ولی اللہ کا ہندوستان کے دار الحرب ہونے کا فیصلہ یا فتویٰ اور دور رس تدبیریں:

حالات کی یہ گرفت، یقیناً تمام مسلمانوں خصوصاً علمائے کرام اور اہل دانش وارشاد کو بے چین کئے ہوئے تھی، مگر زمام کاراں کے ہاتھ میں نہیں تھی، اس لئے یہ حضرات دن رات کی بے چینی، اضطراب اور کڑھن کے علاوہ غالباً زیادہ کچھ نہ کر سکے۔ اس کشمکش اور سخت ابتلاء کے دور میں، حضرت شاہ ولی اللہ وہ پہلے عالم اور مقتدائے عصر تھے، جنہوں نے ظلمت ایام کی اس سیاہ چادر کو چاک کر کے، روشنی اور امید کا آفتاب طلوع کرنے کی کوشش فرمائی تھی، سب سے پہلے حضرت شاہ صاحب نے، اس ملک کو دار الحرب قرار دیا، یہاں جہاد کی ضرورت اور مسلمانوں کی آبرومندانہ زندگی گزارنے کے لئے، ہر طرح کی کوششوں کی نہ صرف حوصلہ افزائی کی، بلکہ اس کی بڑی دور رس، ہمہ جہت اور نتیجہ خیز منصوبہ بندی بھی فرمائی۔

حضرت شاہ صاحب، پایہ تخت دہلی میں جلوہ افروز تھے اور دہلی کے چاروں طرف مختلف سیاسی، علاقائی، مذہبی تنظیموں گروپوں کے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف جو حملے اور یلغار ہو رہی تھی، اور اس کے نتیجہ میں ہر لمحہ جو آفت و بربادی آرہی تھی، اس کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے، معتبر بلکہ ان حوادث کے شکار افراد سے اس کی تفصیل بھی سن رہے تھے، اور اس کی وجہ سے نہایت آزردہ خاطر اور پریشان بھی تھے۔ اگرچہ حضرت شاہ صاحب ان افراد میں سے تھے، جن کے لئے عملی اقدام بہت مشکل نہیں تھا، اگر حضرت شاہ صاحب چاہتے تو خود میدان حرب وضرب میں اتر سکتے تھے، لیکن اس وقت مغل خاندان میں بے دانشی اور نفسانفسی کی جو کیفیت عام تھی، اس میں امید نہیں تھی کہ اس اقدام سے کچھ بڑا فائدہ ہوگا، اس لئے حضرت شاہ صاحب نے اس کا ارادہ نہیں کیا۔ تفہیمات الٰہیہ کی ایک تفہیم میں (ایسا محسوس ہوتا ہے کہ حضرت شاہ صاحب اس سے اپنی ذات کی طرف اشارہ کر رہے ہیں) فرماتے ہیں:

"فلو فرض أن يكون هذا الرجل في زمان واقتضت الأسباب أن يكون إصلاح الناس بإقامة الحروب، ونفث في قلبه إصلاحهم، لقام هذا الرجل بأمر الحرب أتم قيام وكان إماما في الحرب"(۱)

تاہم حضرت شاہ صاحب نے خود کوئی جنگی تنظیم قائم نہیں فرمائی، لیکن ہندی ملت اسلامیہ کو، حوادث کی اس جکڑ سے بسلامت نکالنے کے لئے، کئی پہلوؤں سے نہایت مفید اور نتیجہ خیز اقدامات کئے۔

حضرت شاہ صاحب نے سب سے پہلے اپنے مکتوبات کے ذریعہ، اس فساد و بگاڑ اور ظلم وستم کے خلاف آواز بلند کی، حضرت شاہ صاحب کے، متعدد گرامی نامے اس کی تصدیق کر رہے ہیں، کہ ان حالات سے حضرت شاہ صاحب کس

(۱) التفهيمات الالٰهية ص. ۱۳۹ جلد اول (بجنور: ۱۳۵۵ھ)

toobaa-elibrary.blogspot.com

درجہ دل گرفتہ اور رنجور تھے، اس کے لئے کس طرح سوچ رہے تھے اور تدبیریں فرما رہے تھے۔

اگر چہ اس وقت بھی بظاہر مغل حکومت کا نام موجود تھا، لال قلعہ میں بادشاہ بیٹھتے تھے، مگر قلعہ سے باہر کی دنیا میں کیا ہو رہا تھا، اس پر بادشاہ کی گرفت تھی، نہ قلعہ کے ارباب اقتدار کی۔ بادشاہ خود ایسے بے بس اور پریشان تھے کہ دعا، مشورہ اور تسکین قلب کے لئے، حضرت شاہ صاحب اور دوسرے علماء اور بزرگوں کی خدمات میں حاضری دیتے اور دعاؤں کی درخواست کرتے رہتے تھے۔ حالات کی ستم ظریفی دیکھئے، کہ بادشاہ وقت، شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر کہتا ہے:

غلبۂ کفر وتفرق رعیت بدرجہ رسیدہ است، کہ معلوم است، چنانچہ خواب وخور برمن تلخ شدہ است، دریں باب دعا مطلوب است۔

کفر کا غلبہ اور رعایا کا اختلاف اس حد کو پہنچ گیا ہے، کہ معلوم ہے، جس کی وجہ میرے لئے کھانا پینا حرام ہو گیا ہے، اس کے لئے دعا کی ضرورت ہے۔

بادشاہ وقت خود کہہ رہا ہے، کہ کفر کا غلبہ ہو گیا ہے مگر میں عملاً بے بس ہوں، اس وقت خود حضرت شاہ صاحب کی کیا کیفیت تھی، اور وہ مسلمانوں کو اس عذاب وآفت سے نکالنے کے لئے، کس قدر بے چین ومضطرب تھے، اس کا حضرت شاہ صاحب کے، مکتوبات گرامی سے اندازہ ہو جاتا ہے، ان میں حضرت شاہ صاحب، اس ملک کو نہ صرف دار الحرب، بلکہ دار الکفر لکھ رہے ہیں۔ حضرت شاہ صاحب کی اس رائے یا فتوے کا نسبۃً وضاحت سے، حضرت احمد شاہ ابدالی کے نام خط سے اظہار ہوتا ہے۔ اس خط میں شاہ صاحب نے تحریر فرمایا ہے:

"در ملک ہندوستان غلبہ کفار بایں صورت است کہ درمیاں آمد ضعف مسلمانان بایں صفت، دریں زمانہ بادشاہے کہ صاحب اقتدار وشوکت باشد، وقادر بر شکست لشکر کفار، ودور اندیش جنگ آزمائی، غیر از ملازمان آنحضرت موجود نیست"

ترجمہ: ملک ہندوستان میں کافروں کا غلبہ اس حد تک ہے، جو سامنے آیا اور مسلمانوں کی کمزوری کی یہ حالت، اس زمانہ میں کوئی ایسا بادشاہ، جو شوکت واقتدار والا بھی ہو، کافروں کے لشکر کو شکست بھی دے سکتا ہو اور دور اندیش بھی ہو۔ جناب والا کے علاوہ [موجود] نہیں ہے۔

اسی خط میں مزید فرماتے ہیں: "ہمت بانہمت را بجانب جہاد کفار ایں نواحی مصروف فرمایند" (۱)

ترجمہ: اپنی عالی اقتدار والی ہمت کو، اس علاقے کے کافروں سے جہاد کی طرف مشغول فرمائیں۔

اور یہ بالکل واضح ہے، کہ جہاد یا مسلم حکومت ومملکت سے نہیں ہو سکتا، جہاد کے لئے اس ملک کا دار الحرب یا دار الکفر ہونا

(۱) حضرت شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات، مرتبہ خلیق احمد نظامی صاحب ص: ۱۱/۱۲ (دہلی: ۱۳۸۸ھ/۱۹۶۹ء)

ضروری ہے۔ اس مکتوب کے ابتدائی سطور بھی اہم اور بڑی معنی خیز ہیں تحریر ہے

"وجہ یاد شاہان اسلام نعمتے ست بغایت عظیم، وموہب نصیب بادشاہان دو چیز ست، یکے سر شوکت کفار وظہور ملت اسلام۔ تا وقتے کہ بادشاہان اسلام جہاد نکنند و بجنود اسلام دولت کفار برہم نہ زنند، زمین خدائے تعالیٰ دارالاسلام نگردد، کفار بر ضعفے مسلمین تاختہ، جان ومال ایشاں برباد فنا دہند" (۱)

ترجمہ: عالی مرتبت بادشاہوں کی موجودگی بہت بڑی، نہایت عظیم نعمت ہے اور بادشاہوں کا مرتبہ بلند کرنے والی دو چیزیں ہیں، کافروں کی شوکت وقوت کو توڑنا اور ملت اسلام کو نمایاں کرنا، جب کہ سلاطین اسلام جہاد نہ کریں اور اسلامی لشکروں کے ذریعہ سے کافروں کا غلبہ ختم نہ کریں، اللہ کی زمین دارالاسلام نہیں ہو سکتی۔ کافر کمزور مسلمانوں پر حملے کرتے، ان کے جان اور مال فنا کی نذر کر رہے ہیں۔

راقم سطور کا خیال ہے کہ حضرت شاہ صاحب کا یہ گرامی نامہ سنہ ۱۱۷۳–۱۱۷۲ھ (۱۷۵۹ء) کا لکھا ہوا ہے، کیوں کہ ۱۷۵۹ء (۱۱۷۲ھ کے نصف ثانی) میں احمد شاہ ابدالی ہندوستان آگیا تھا۔ اسی سے ضمناً یہ بھی معلوم ہوگیا کہ حضرت شاہ ولی اللہ سنہ ۱۸۵۷ء سے سو سال پہلے ہندوستان کے دار الحرب ہونے کا فیصلہ فرما چکے تھے۔

حضرت شاہ صاحب نے نواب عبید اللہ خان کشمیری کے نام، گرامی نامہ میں بھی (جو بظاہر، مذکورہ بالا خط کے بعد لکھا گیا ہے) اس وقت کے ہندوستان کو صاف دار الکفر لکھا ہے۔ تحریر ہے

"رقیمہ سامیہ رسید، واستفسار رفتہ کہ از اقامت در دیار جٹ کردہ بودند معلوم شد

عزیز القدر! از غیب بر دل جمع مکرر داعیہ دعا بہ تقصی ہر دو فریق فرود می آید۔ ومہار در میان ایشان نبودہ خیر شرط است، اگر دریں ایام عزم حج کنند از ہمہ بہتر، ہم در دنیا وہم در آخرت، اگر میسر نشود، انتقال از دار الکفر خود ضرور است" (۲)

ترجمہ: گرامی نامہ پہنچا اور سوال جس میں جاٹوں کے علاقہ میں قیام کے متعلق دریافت کیا ہے، معلوم ہوا۔ میرے عزیز! غیب سے ان دونوں فریقوں کے خاتمہ کی، اہتمام سے دعا کا دل پر بار بار تقاضہ ہوتا ہے اہل — ہر گز ہر گز ان کے بیچ میں نہ رہنا چاہئے، احتیاط ضروری ہے۔ اگر ان دنوں میں حج کا ارادہ کریں، تو سب سے بہتر ہے، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ اگر حج کے لئے جانے کا موقع نہ ہو، تو دار الکفر سے نکل جانا خود بھی ضروری ہے۔

---

(۱) کلمات حضرت شاہ صاحب کے مکتوب بنام [illegible] ملاحظہ ہو مکتوبات حضرت شاہ ولی اللہ حصہ دوم [illegible] مؤلف مرتبہ ڈاکٹر [illegible] شاہ [illegible] [illegible] سے [illegible] مکتوبات میں شامل نہیں ہے۔

(۲) سیاسی مکتوبات صفحہ (۱۰) [illegible] ۹۹ [illegible] سیاسی مکتوبات میں [illegible] سیاسی مکتوبات میں صرف یہ ترجمہ [illegible] صفحہ ۵۸۔

toobaa-elibrary.blogspot.com

حضرت شاہ صاحب اور ہندوستان کے چند، اور بڑے علماء کی گذارشات پر، احمد شاہ ابدالی نے خاطر خواہ توجہ کی اور حضرت شاہ صاحب کے متوسلین نے بھی، ان ہدایات و خطوط کی تعمیل میں فخر و مسرت محسوس کی، احمد شاہ ابدالی حضرت شاہ صاحب کے مکتوب نیز علمائے ہند کے چند اور مکتوبات اور دعوت ناموں کی وجہ سے ہندوستان آیا، اور پانی پت کے میدان میں، ایک طاقتور اور بھرپور حملہ کر کے، ان قوتوں کے ہندوستان پر قبضہ اور حکومت کے منصوبہ پر ایسی کاری بھرپور ضرب لگائی اور ان طالع آزماؤں کو ایسا کمزور اور بے دست و پا کر دیا، کہ وہ سر اٹھانے کے لائق نہ رہے۔

ابدالی ربیع الاول سنہ ۱۱۷۳ھ (یکم نومبر ۱۷۵۹ء) کو پانی پت کے میدان میں پہنچا اور تقریباً ڈھائی مہینے تک جنگ کے بعد، اواخر جمادی الاولیٰ (۱۴ جنوری ۱۷۶۱ء) مرہٹوں کو شکست فاش دی

حضرت شاہ صاحب کی، یہ تدبیر بلاشبہ نہایت کارگر ثابت ہوتی، اگر ابدالی کی تاریخی کامیابی کے بعد، ہندوستان کی سیاسی قیادت اور وزارت عظمیٰ، حضرت شاہ صاحب کے معتمد افراد میں سے نواب نجیب الدولہ [جو اپنے جنگی تجربہ، دور اندیشی، بے مثال دانشمندی اور حوصلہ کی وجہ سے، احمد شاہ ابدالی کے لئے بھی ایک دریافت کی حیثیت رکھتے تھے] کے سپرد کر دی جاتی، تو بعد کے حالات اس سے بہت مختلف ہوتے، جو سامنے آئے ممکن تھا کہ اس سے مغل خاندان اور حکومت کی عمر میں بھی، خاصہ اضافہ ہو جاتا، ابدالی کی بھی یہی رائے تھی، لیکن درباری سازشوں، مغل خاندان اور امراء کے باہمی سخت اختلافات اور عہدہ و منصب کے خواہشمندوں کی، شاطرانہ چالوں نے، اس انتظام کو کامیاب نہ ہونے دیا۔ نجیب الدولہ کی جگہ ایک اور وزیر اعظم منتخب کر لیا گیا، جس کا انجام معلوم ہے۔ مغل خاندان کے ارباب اقتدار کی بے اتفاقی، رہبر و اعتماد کے فقدان کی وجہ سے، بات پھر وہیں آگئی جہاں سے چلی تھی کہ نہ حاکم کو استحکام حاصل تھا، نہ حکومت کو۔ جو دیانت و انصاف، دور اندیشی و استحکام کی بات کرتا، اس کو خود غرض و مطلب پرست کہا جاتا، اہل غرض اور خوشامدیوں کو حکومت و امراء کا مخلص و مددگار سمجھا جاتا تھا۔ اس خود غرضی اور افراتفری کی وجہ سے، بادشاہ اور سربراہان حکومت ایک تماشہ بن کر رہ گئے تھے، کبھی کسی کو حکومت سپرد کی جاتی، کبھی کسی اور کو! آج ایک شہزادہ تخت پر بیٹھتا کل دوسرا، اس کی جگہ لے لیتا، یوں حکومت کا اعتبار اور مغل خاندان کی رہی سہی ساکھ بھی خاک میں مل گئی تھی۔

انگریز بہت دنوں سے اس کھیل کو بہت غور سے دیکھ رہا تھا، وہ اس سے صحیح وقت پر بھرپور فائدہ اٹھانے کی فکر میں تھا۔ سیاسی شطرنج کی بہت عیاری کے ساتھ بساط بچھا چکا تھا، اس کے مہرے حرکت میں تھے، لال قلعہ پر قبضہ اس کی بنیادی ترجیحات میں شامل تھا، بالآخر، انگریزوں نے سنہ ۱۸۰۳ء میں دہلی پر باقاعدہ قبضہ کر لیا۔ اکبر، جہانگیر اور شاہجہاں کی عظمتوں کے نام لیوا اور تخت سلطنت کے دعویدار، انگریزوں کی ماہانہ پنشن پر گزارہ کرنے لگے اور ان کے اشارہ چشم و ابرو کے محتاج ہو کر رہ گئے۔

وہ بھی دیکھا یہ بھی دیکھو!

toobaa-elibrary.blogspot.com

شاہ ولی اللہ کے معاصر بڑے علماء اور ان کے وابستگان کے فتاویٰ: حضرت شاہ ولی اللہ نے اپنے دور کے حالات دیکھ کر، اس ملک کی مذہبی شرعی حیثیت کے متعلق، جو رائے ظاہر فرمائی تھی، تقریباً وہی رائے حضرت شاہ صاحب کے نامور معاصر حضرت مرزا مظہر جان جاناں کی بھی تھی۔ ان دونوں کی وجہ سے، بلکہ حالات کی اس گرفت کی وجہ سے، جس کے اثرات بد سے بدتر ہوتے جا رہے تھے، ان دونوں کے بڑے طاقتور جانشینوں اور نمائندوں کی بھی، یہی رائے اور فتویٰ تھا کہ موجودہ حالات کی وجہ سے، ہندوستان قطعی طور پر دار الحرب ہے۔ ان حضرات میں سے جو اس رائے کے قائل علم و بردار تھے، ان میں حضرت مرزا مظہر کے نمائندہ اور علمی جانشین، حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی اور حضرت شاہ ولی اللہ کے برگزیدہ اخلاف کرام شامل تھے۔ جس میں حضرت شاہ عبدالعزیز، حضرت شاہ رفیع الدین، نیز اس خاندان کے مہر منیر، حضرت شاہ محمد اسماعیل شہید، مولانا عبدالحی بڈھانوی اور مولانا شاہ محمد اسحاق کے علاوہ، حضرت مفتی الٰہی بخش کاندھلوی، مفتی شرف الدین رام پوری (۱) وغیرہ کے اسمائے گرامی بھی شامل ہیں۔ ان ہی فتاویٰ اور نظریات کی وجہ سے اور خاندان ولی اللّٰہی سے وابستہ، مختلف خطوں میں مقیم درجنوں علماء اور اہل ارشاد و معرفت نے بھی، اسی قسم کے فتاویٰ تحریر فرما کر، اپنے اکابر کی راہ پر چلنے کا عہد کیا اور اپنے عملی اقدامات سے، ان فتاویٰ کی توثیق و تصدیق کی۔ ایسے فتاویٰ کی خاصی تعداد ہے، جن کے فوائد و اثرات مختلف حیثیتوں سے ظاہر ہوتے رہے۔

کیا یہ فتوے صرف انگریز کے لئے تھے؟ یہاں یہ عرض کرنا ضروری ہے، کہ جب علماء کے ہندوستان کو دار الحرب قرار دینے کے، ابتدائی فتاویٰ کا تذکرہ آتا ہے اور برصغیر ہند کی دینی علمی سیاسی تاریخ پر، ان کے اثرات کا مطالعہ کیا جاتا ہے، تو عموماً یہ کہا جاتا ہے کہ، ان حضرات کی یہ جد و جہد اور کوشش، انگریزوں اور صرف انگریزوں کے خلاف تھی، اور یہی ان حضرات کے سیاسی نظریات کا بنیادی نقطہ اور مقصد تھا، مگر اس خیال کے لئے کوئی علمی بنیاد موجود نہیں۔ ان حضرات کے فتاویٰ دراصل ان تمام طالع آزما قوتوں، اور ظلم و جبر کی ایسی تمام طاقتوں کے بڑھتے اثرات کی وجہ سے صادر ہوئے تھے، جنہوں نے انگریز کے اس خطہ میں آنے سے پہلے، یہاں مسلمانوں کا جینا حرام کر رکھا تھا، جن کی وجہ سے مسلمانوں کی آبرو اور جان مال کو ہر وقت خطرہ رہتا تھا، جب جس کا جی چاہتا ان کے مردوں کو قتل کرتا، ان کی عورتوں کو بے آبرو کرکے ان کے مکانات کو نذر آتش کر دیتا تھا، ان حضرات کے پہلے اور بنیادی فتوے، ان ہی لوگوں کی وجہ سے تھے۔ حضرت شاہ ولی اللہ اور حضرت مرزا مظہر جان جاناں کی تحریروں میں اس کی صراحت ہے، حضرت شاہ عبدالعزیز کے فتاویٰ میں بھی، اس کے اشارات مل جاتے ہیں، اس لئے ان تمام فتاویٰ کو صرف انگریزوں کے حکومت و اقتدار سے وابستہ کرنا، دیانت و انصاف نہیں، لیکن یہ صحیح ہے کہ شمالی ہندوستان، خصوصاً دہلی پر انگریزوں کے قبضہ کے بعد، ان فتاویٰ کا رخ انگریز کی جانب ہو گیا تھا، کیوں کہ وہ

(۱) اس میں چند فتاویٰ معلومہ مطبوعہ ہیں، شاید حضرت اور غیر مطبوعہ ہیں جس میں سے چند کی اصل دلی کے فوٹو سٹیٹ ہمارے ذخیرہ میں موجود ہیں۔

toobaa-el brary blogspot.com

فکر ومزاج میں، ان قوتوں سے کسی طرح مختلف نہیں تھے جنھوں نے انگریزوں کے آنے سے پہلے، مسلمانوں پر عرصہ حیات تنگ کیا ہوا تھا، انگریزوں کے بھی ملک گیری کے وہی منصوبے تھے، وہ بھی مسلمانوں کو زیر کرکے، وہی انجام دیکھنا چاہتے تھے، جس کا انگریزوں سے پہلے یہاں موجود مسلمانوں سے معرکہ آرا قوتیں، اظہار وتجربہ کرا چکی تھیں۔ مگر اس وقت پر مسلمان اور مملکت ہند جن مسائل ومشکلات کا شکار تھی، اس کا حل صرف فتوے لکھنے سے ممکن نہیں تھا، اس کے لئے ضروری تھا۔ مسلمان میدان میں آکر عملی جدوجہد کریں، یہی وہ خیال اور منصوبہ تھا، جو اولاً تحریک سید احمد شہید کی صورت میں، اور پھر ۱۸۵۷ء کی جدوجہد میں پوری شان سے ظاہر ہوا۔

اگرچہ ان دونوں تحریکات کے جنگی میدانی منصوبے ناکام رہے اور ان سے وہ مقاصد حاصل نہیں ہوئے جن کے لئے ان کا انتظام کیا گیا تھا، لیکن ان کے معنوی فوائد بے شمار ہیں، اس وقت سے آج تک ان تحریکات کے رہنماؤں اور مقاصد سے دلچسپی برقرار ہے، اور ان کے مخلص رہنما، قوم وملت کے لئے نشان راہ کی حیثیت سے، جانے پہچانے جاتے ہیں۔ مگر یہ بھی ایک ناقابل تردید تاریخی حقیقت ہے کہ، اس جدوجہد، خصوصاً ۱۸۵۷ء کی تحریک سے، جو نقصان ہوا تھا وہ ناقابل تلافی ہی رہا۔ سنہ ۱۸۵۷ء کی تحریک سے ملکی قوتوں کو استحکام تو کیا ملتا، ملکی اشخاص مسلمان ہوں یا غیر مسلم، ان حقوق ومراعات سے بھی محروم ہو گئے، جو ان کو انگریزوں کے ۱۸۵۷ء سے پہلے کے نظام میں حاصل تھیں۔ ۱۸۵۷ء کی تحریک کے حد معلوم کا برائے نام اقتدار اور قلعہ معلی کی حکمرانی بھی گزرے وقت کی داستان، اور ملک کی تاریخ کا ایک الم ناک باب بن گیا۔ ملک وملت کی تباہی وبربادی جو کیفیت ہوئی وہ محتاج بیان نہیں۔ لاکھوں لاکھ افراد کو سزائے موت ہوئی، پھانسیاں دی گئیں، یہاں سے ہزاروں لاکھوں افراد کو ہجرت کرنی پڑی، ہجرت، جلاوطنی، کالے پانی کی سزائیں برداشت کیں، تاحیات قید کی نہ ختم ہونے والی اذیت اس کے علاوہ تھی، اور

گھر میرا جو جلتا تھا کچھ لوگ یہ کہتے تھے

کیا آگ سنہری ہے، کیا آنچ سہانی ہے

۱۸۵۷ء کے بعد کے دور استبداد کے تلخ تجربات:

۱۸۵۷ء کی تحریک کے بعد، انگریز اس پورے برصغیر پر قابض ہو گئے تھے، ان کی حکومت ہر سیاہ وسفید کی مالک اور جبر واستبداد کے ہتھیاروں سے مسلح، ایک ایسی جابرانہ اور قاہرانہ قوت تھی، کہ اس کے خلاف آواز نکالنا، بلکہ دم مارنا بھی آسان نہیں تھا، اس لئے اس بڑے معرکہ، ملک وملت کے لاکھوں افراد کی جانوں کی قربانی اور بے شمار آلام ومصائب برداشت کرنے کے باوجود بھی، امتحان باقی رہا اور اس ملک کی شرعی حیثیت میں کچھ تبدیلی نہیں آئی، برصغیر ہند ۱۸۵۷ء کی تحریک سے پہلے جس طرح دار الحرب تھا، اب بھی

اسی طرح رہا، بلکہ ان حالات وحوادث نے، اس کی شدت اور قہرناکی میں کچھ اضافہ ہی کر دیا تھا۔

فکر و عمل کا ایک اور میدان: یہ بھی ایک واضح حقیقت ہے کہ ۱۸۵۷ء کی مسلح جدوجہد کے بعد علماء نہ عوام، اس لائق نہیں رہ گئے تھے، کہ حکومت کے سامنے دوبارہ آ سکیں، اور اپنے حقوق اور مطالبات کے لئے، کوئی بڑا میدانی منصوبہ عمل میں لا سکیں، لیکن جہاں تک رائے اور نظریہ کی بات تھی، اس میں کچھ تبدیلی نہیں آئی تھی، اس لئے اکثر علمائے ہند، خصوصاً خاندان حضرت شاہ ولی اللہ سے وابستہ اور اس دینی علمی اصلاحی کارواں سے منسلک، علماء کی وہی رائے رہی، جو ۱۸۵۷ء سے پہلے تھی۔ حضرت شاہ محمد اسحاق کے متعدد شاگردان، مولانا نواب قطب الدین دہلوی، مولانا عبدالقیوم بڈھانوی، مولانا مفتی محمد ایوب پھلتی اور اس خانوادہ علم و عمل کے، بڑے دینی علمی نمائندوں میں سے، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی وغیرہ اکابر علماء کا اس پر اتفاق تھا کہ یہ ملک اب بھی اسی طرح دار الحرب ہے، جس طرح اس سے پہلے دور میں تھا۔

لیکن ان حضرات کو ۱۸۵۷ء کے تجربہ نے بتا دیا تھا کہ اب جدوجہد کا میدان بدل گیا ہے، موجودہ حالات میں ہتھیار اٹھانا، ملک میں مسلمانوں کے ٹوٹے پھوٹے بکھرے وجود، اور ان کے رہے سہے دینی کام، علماء اور ذمہ داران کو ختم کرنے، اور اجتماعی خودکشی کے مترادف ہوگا۔ اس لئے ہتھیار، جنگ کے نظام اور ارادہ کو وقتی طور پر فراموش کر کے، دینی تعمیر و ترقی کے اور کاموں کو اولیت دینی چاہئے، اس کے لئے پہلی بنیادی ضرورت، عوام کی دینی تعلیم و تربیت کے لئے ایک مرتب و مسلسل نظام اور ایک متعین فکر و منہج کی تشکیل کی تھی، جس کی روشنی میں آئندہ نسلیں بہترین دینی تعلیم و تربیت، معاملات و معاشرت کی درستگی و ہم آہنگی، مستقبل کی بہتر نشوونما اور اعلیٰ ترین منصوبوں اور دماغوں کی تشکیل کر سکیں، اس مقصد کے لئے ان علمائے کرام نے جو طریقہ اپنایا، واقعہ یہ ہے کہ ان حالات میں، مسلمانوں کی سرفرازی کے لئے، اس سے بہتر تجویز و انتخاب ممکن نہیں تھا۔

یہ اسلامی دینی تعلیم کے لئے، ایسے مدرسوں کا آغاز تھا، جو حکمرانوں اور ارباب دولت و ثروت کی نگاہ کرم کے منتظر و پروردہ نہ ہوں، بلکہ ان کی اساس حق تعالیٰ کے اعتماد اور توکل علی اللہ پر رکھی جائے، ان کا سفر عام مسلمانوں کے تعاون سے آگے بڑھے، اور منزل مقصود تک پہنچے۔ یہ کوشش اتنی کامیاب ہوئی، کہ اس کے جلو میں دو چار نہیں، پچاسوں سینکڑوں مدرسوں کا جال بچھ گیا، اور یہ مدارس نہ صرف اس خطہ، بلکہ پورے برصغیر اور بعد میں پوری دنیا کے لئے، ایک نمونہ اور مثالی ثابت ہوئے، جس کی اسلامی تاریخ میں کوئی نظیر نہیں تھی۔

اگرچہ یہ مدارس اپنے قائم کرنے والوں کی زندگی میں ہی، تناور درخت بن کر سایہ دینے لگے تھے، اور اہل دین کا ایک بڑا طبقہ، ان کی ٹھنڈی چھاؤں میں دنیا و آخرت کی نعمتوں سے ہمکنار ہونے لگا تھا، مگر اس سب کے باوجود، ان

toobaa-elibrary.blogspot.com

مدارس کے منصوبہ ساز، اپنے بنیادی مقاصد سے کبھی بھی (کسی) پہلو غافل نہیں ہوئے، انہوں نے اس ملک کے حال اور مستقبل کے نقشہ میں رنگ بھرنے، اس کے دارالحرب ہونے اور آئندہ کے متوقع سیاسی اقدامات سے متعلق، بنیادی رائے کا تذکرہ جاری رکھا، وہ اس کو اسی طرح دارالحرب کہتے اور لکھتے رہے، جس طرح اس سے پہلے کہتے تھے، ان حضرات میں حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ کے بعد سب سے ممتاز نام حضرت مولانا گنگوہیؒ کا ہے۔

انگریز کے دور میں ملک کی شرعی حیثیت اور سیاسی تحریکات پر حضرت گنگوہی کے فتاویٰ:

حضرت مولانا گنگوہیؒ کے، انگریزی حکومت، اس کی شرعی حیثیت اور اس کی مذمت و مزاحمت کے حوالے سے ہم تین فتوے دریافت ہیں، ان میں سب سے پہلا مفصل اور جامع فتویٰ وہ ہے، جو مولانا مفتی محمد شفیع عثمانیؒ نے ترجمہ کر کے سنہ ۱۳۵۲ھ (۱۹۳۳ء) میں دیوبند سے شائع کیا تھا اور فتویٰ دارالحرب کے نام سے متعارف ہے۔ اس فتوے کا ہندوستان کی دینی علمی تاریخ، خصوصاً سنہ ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک کے سیاسی احوال اور ان کے متعلقات میں بار بار تذکرہ آتا ہے، مگر جب یہ فتویٰ شائع ہوا، اس وقت اس کا سوال اور تاریخ تحریر دریافت نہیں ہوئی تھی، اس لئے ان معلومات و متعلقات کے لئے تلاش و جستجو کی جگہ قرائن و قیاسات پر عمارت کھڑی کی گئی، جس کی وجہ سے اس فتوے پر جو تبصرے ہوئے اور اس کی جو تحقیقات کی گئیں، ان میں کئی روایتیں اور اطلاعات ایسی بھی شامل ہوگئی تھیں، جو صحیح نہیں۔ اس لئے اس کے متن کی نسبۃً قدیم نقل کی جستجو، اس فتوے کی تحریر کا سبب، فتویٰ دریافت کرنے والے عالم کا نام، اور اس کا سن تحریر معلوم ہونا بھی بے حد ضروری تھا۔ ان پہلوؤں کی دریافت کے بعد ہی، اس فتوے کی ملی سیاسی تاریخ سے وابستگی اور اس پر اس کے اثرات کا صحیح علم ہوسکتا ہے۔

زیر نظر فتویٰ اور اس کے متعلق چند مباحث:

آئندہ صفحات میں اس فتوے کا سوال نامہ، اور اس فتوے کا مکمل قدیم ترین معلوم متن پیش کیا جا رہا ہے، مگر اس فتوے اور اس کے مفصل سوال نامہ کے مطالعہ سے پہلے، اس موضوع پر حضرت مولانا گنگوہیؒ کے، تینوں معلوم فتووں کے متعلق ضروری معلومات اور ان کے حوالے سے نقل بعض غلط اور بے اصل اطلاعات کی تحقیق و تنقیح ضروری ہے، متعلقہ عنوانات یہ ہیں، جس پر آئندہ صفحات میں کچھ گفتگو ہوگی

(۱) اس فتوے کا زمانہ تحریر اور اس کی تحریک ۱۸۵۷ء سے وابستگی کی روایات کی حقیقت؟

(۲) حضرت مولانا گنگوہیؒ سے یہ فتویٰ دریافت کرنے والے عالم کون تھے، ان کے احوال اور مشتبہ اطلاعات پر نظر

(۳) اس فتوے کے قلمی نسخے، ان کے کاتب اور ان کے مندرجات

(۴) اس فتوی کی پہلی طباعت، اس کا ترجمہ، حاشیہ اور توضیحات نگاروں کا تعارف

(۵) حضرت مولانا گنگوہی کے اس موضوع: ہندوستان کی انگریز کے دور میں شرعی حیثیت پر معلوم چند اور فتوے۔

(۶) زیر نظر نسخہ اور اس کی ترتیب

آئندہ صفحات اسی اجمال کی تفصیل پر مشتمل ہیں۔

اس فتوے کے سنہ تحریر اور اس کے ۱۸۵۷ء سے وابستہ ہونے کی اطلاعات پر ایک نظر: حضرت مولانا گنگوہی کا یہ فتویٰ، انگریزوں کے دور حکومت میں ہندوستان کے دار الحرب ہونے کے موضوع پر، برصغیر کے معروف ترین، چند فتووں میں سے ایک ہے۔ بعض اہل قلم اور مورخین نے اس کا سنہ ۱۸۵۷ء کے واقعات و تحریک سے مباحث اور اس کے ماخذ میں بھی شمار کیا ہے۔ مثلاً مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے لکھا ہے:

"ہم یہ سمجھتے ہیں کہ مولانا گنگوہی کا یہ فتویٰ بزبان فارسی، (شائع کردہ مفتی محمد شفیع صاحب) یا تو ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی سے پہلے کا ہے یا اس کے فوراً بعد کا، جب کہ پکڑ دھکڑ بڑے پیمانے پر جاری تھی"۔ ( )

یہ خیال اور ظن تو صحیح نہیں ہے۔ یہ غلط فہمی غالباً اس وجہ سے ہوئی کہ اب تک اس فتوے کا سوال نامہ اور اس کی تاریخ تحریر و سوال معلوم نہیں تھی، صرف یہ معلوم تھا کہ اس کے مصنف، شیخ حضرت مولانا گنگوہی، ۱۸۵۷ء کی تحریک کے قائدین اہل مدین سے تھے، لہٰذا یہ خیال کر لیا گیا کہ حضرت مولانا نے یہ فتویٰ اس تحریک کے دوران یا اس کے بعد لکھا ہوگا، لیکن اب جب کہ اس کے سوال و جواب دونوں کی تاریخیں اور سن تحریر صحیح طور پر معلوم ہو گئے ہیں، اس غلط فہمی کی کوئی وجہ نہیں۔

یہ فتویٰ تحریک سنہ ۱۸۵۷ء سے (سن عیسوی کے حساب سے) پورے چھتیس سال بعد وجود میں آیا تھا، اس کے محرک مولانا سعید الدین بن وحید الدین رمولوی (رامپور منیہاران ضلع سہارنپور یوپی) تھے۔ مولانا سعید الدین نے، جو اس وقت سعید آباد، منتھرا میں مدرس و مدرس تھے، حضرت مولانا کی خدمت میں، رمضان المبارک ۱۳۱۰ھ میں ہندوستان کی اس وقت کی شرعی حیثیت سے متعلق، ایک مفصل سوال نامہ ارسال کیا تھا، حضرت مولانا نے اس کا مفصل جواب لکھا، جو ۷ رشوال ۱۳۱۰ھ [۲۴ اپریل ۱۸۹۳ء] کو مکمل ہوا اور یہ عجب حسن توارد ہے، کیوں کہ ۱۸۵۷ء کی تحریک کا بھی ۲۴ اپریل کو آغاز ہوا تھا۔

لہٰذا اس فتوے کا ۱۸۵۷ء کی تحریک اور اس کے واقعات دونوں سے کچھ تعلق نہیں، اس کو ۱۸۵۷ء سے وابستہ کرنا اور اس ضمن میں اس کا تذکرہ درست نہیں۔

(۲) اس فتوے کا مولانا سعد الدین کشمیری سے کچھ واسطہ نہیں: اس کے پہلے مرتب و ناشر، مولانا مفتی محمد شفیع صاحب [illegible] کا سوال نامہ [illegible] حضرت مفتی صاحب نے اس کا کسی رخ سے کچھ تذکرہ کیا، کہ حضرت

([illegible] ۱۹۶۸ء)

مولانا گنگوہی سے یہ سوال کس نے کیا تھا، اس موضوع پر سب سے پہلے مولانا سید محمد میاں صاحب دیوبندی نے، اپنی تالیف "علمائے حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے" میں (۱) وضاحت کی ہے اور لکھا ہے کہ:

"چنانچہ مولانا سعد الدین صاحب کشمیری اور مولانا امان اللہ صاحب کشمیری نے، ہندوستان کے دار الحرب ہونے کے متعلق، حضرت مولانا گنگوہی سے استفتاء کیا (۲)"

لیکن مولانا محمد میاں صاحب کے اس فقرہ میں شامل، دونوں طرح غلط اور بے ثبوت ہیں۔ دونوں مرحوموں نے حضرت مولانا گنگوہی سے، ہندوستان کی شرعی حیثیت کے حوالے سے، مفصل سوال کیا تھا اور جس کے جواب میں حضرت مولانا نے یہ مشہور فتوی تحریر فرمایا تھا، ان کا نام سعید الدین تھا، سعد الدین نہیں اور ان کا وطن سہارنپور کا ایک قدیم قصبہ رامپور منیہاران (ضلع سہارنپور، یوپی) تھا، اس لئے اس فتوے کو مولانا سعد الدین کشمیری سے منتسب ہے جب کہ اگرچہ مولانا امان اللہ کشمیری اور مولانا سعد الدین کشمیری دونوں، حضرت مولانا گنگوہی کے شاگرد تھے (۳) مگر جہاں تک معلوم ہے، ان دونوں کا اس فتوے سے کچھ تعلق نہیں، مگر ان دونوں کی علمی دنیا میں بوجوہ شہرت تھی شاید اسی شہرت کی وجہ سے مولانا محمد میاں صاحب کو یہ مغالطہ ہوا

---

(۱) علمائے حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے دو حصوں پر مشتمل ہے، پہلے حصہ کے حاشیہ پر تالیف کی تاریخ ختم ۲۲ محرم ۱۳۵۸ھ مطابق ۱۳ مارچ ۱۹۳۹ء درج ہے [illegible] ص ۳۰۴ حصہ اول (جمعیۃ علماء ہند دہلی)

(۲) علمائے حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے ص ۹۶ حصہ اول [illegible]

(۳) [illegible] رشیدیہ [illegible] حضرت مولانا گنگوہی ص ۱۹ [illegible] مولانا امان اللہ کشمیری کا تعارف [illegible]

[illegible] سعد الدین صاحب، قاضی عربی کشمیری [illegible] کے متعلق چند معلومات منسوب ہیں [illegible] حضرت مولانا گنگوہی سے [illegible] مولانا سعد الدین کشمیری کے قدیم خاندان قضات سے [illegible] حضرت مولانا [illegible] مولانا محمد یحییٰ کاندھلوی [illegible] سعد الدین صاحب [illegible] میں حضرت سے [illegible] اور واپس [illegible] مولانا کا بہت مختصر [illegible] لکھا ہے۔

میرٹھی نے حضرت مولانا گنگوہی کے شاگردوں میں مولانا کا [illegible] تذکرۃ الرشید میں ۹۷ حصہ دوم [illegible]

"مولوی سعد الدین صاحب بھی گنگوہی دربار کے تعلیم یافتہ ہیں، جو آج کل سری نگر، کشمیری میں [illegible] مولانا [illegible] کاندھلوی سے ملاقات [illegible] کاندھلوی [illegible]

مولانا سعد الدین صاحب [illegible] مولانا سعد الدین کے کاندھلہ [illegible] یادداشت [illegible] روزنامچہ میں ۸ محرم [illegible] ۱۳۱۳ھ (۳۱ اگست ۱۸۹۵ء) کی یادداشت میں [illegible]

"مولوی سعد الدین کشمیری [illegible] دورۂ حدیث مقام گنگوہ شریف [illegible] روزنامچہ [illegible]

[illegible] سال بعد ملاقات [illegible] ہوئی۔ [illegible] مولانا سعد الدین سے [illegible] کشمیر گئے تھے وہاں مولانا سعد الدین [illegible] (صفر ۱۳۱۵ھ) [illegible] جون ۱۸۹۸ء [illegible] ۱۸۹۸ء [illegible] مشہور کتاب الفاروق [illegible]

سلیمان ندوی ص ۳۳۴ (عظم گڑھ ۱۹۶۹ء) [illegible]

[illegible] سعد الدین صاحب کشمیری نے حضرت گنگوہی سے روایت [illegible] فتاوی رشیدیہ میں مختلف [illegible]

بہرحال یہ تو طے ہے کہ اس فتوے کے مستفتی مولانا سعدالدین کشمیری نہیں، بلکہ مولانا سعیدالدین رام پوری تھے، مگر کون سے سعیدالدین؟ کیونکہ اس وقت رامپور میں بھی سعیدالدین نام کے دو فاضل تھے، دونوں جید عالم تھے، دونوں فقہ و فتاویٰ سے وابستگی رکھتے تھے، ان میں سے ایک حضرت مولانا گنگوہی کے خاندانی عزیز، حدیث میں شاگرد، مرید و منتسب اور خاص نیاز مند تھے۔ دوسرے تھانہ بھون کے فاروقی خاندان کے فرد تھے، مولانا مفتی عبدالقیوم بڈھانوی سے بیعت اور صاحب درس وافادہ شخص تھے۔ اس لیے حتمی اور متعین طور پر یہ معلوم نہیں کہ ان میں کس نے حضرت مولانا گنگوہی سے، ہندوستان کی شرعی حیثیت کے متعلق سوال کیا تھا، لیکن قرین قیاس یہی ہے کہ مولانا سعیدالدین خلف مولانا وحیدالدین رام پوری نے دریافت کیا ہوگا؟ وہ حضرت کے معتمد اور قریبی اصحاب میں سے تھے، نیز ان کی حضرت سے خط و کتابت بھی تھی اور دوسرے صاحب کا مستفتی ہونا بھی غیر متوقع نہیں، ان کو بھی دارالحرب کے موضوع سے دلچسپی تھی، اس لیے یہاں دونوں صاحبان کا مختصر تعارف تحریر ہے۔ ممکن ہے کہ آئندہ کسی ذریعہ سے ان میں سے کسی ایک کی تعیین ہو جائے، تاہم راقم سطور کا خیال ہے کہ یہ مولانا سعیدالدین بن وحیدالدین رام پوری ہی تھے۔ فتویٰ دارالحرب کے سوال نامہ، یا مکتوب مولانا سعیدالدین کے آغاز پر، حضرت مولانا گنگوہی کے جو القاب و کلمات درج ہیں ان سے بھی یہی تاثر ملتا ہے کہ یہ تحریر سوال مولانا سعیدالدین (بن حافظ وحیدالدین) کا ہوگا، اس لیے ان کے تعارف کو اولیت دی گئی ہے۔

مولانا سعیدالدین بن وحیدالدین رام پوری: رامپور منیہاران ضلع سہارنپور (مغربی یوپی) کا ایک پرانا قصبہ ہے، یہاں ایک انصاری خاندان کبھی بادشاہ کے دور میں سہارنپور سے آکر آباد ہوا تھا، جس میں علم کا سلسلہ دیر تک چلا۔(۱) اس خاندان کے ایک فرد مولانا حافظ وحیدالدین رام پوری تھے، جو حکیم ضیاءالدین رام پوری کے غالباً چچا زاد بھائی بھی تھے۔

حافظ وحیدالدین ذاکر شاغل اور باخدا شخص اور حضرت حاجی امداد اللہ سے بیعت تھے، حضرت مولانا گنگوہی سے بے تکلف روابط رکھتے تھے اور حضرت سے متعدد بار ملنے بھی گیا تھا، ان کے حضرت مولانا کے نام خطوط سے، حافظ صاحب کی رفعت پرواز کا اندازہ ہوتا ہے۔ ایک خط میں لکھا ہے

"اب سفر نامہ بندہ تم کو آپ سے محمود جانتا ہے، خصوصاً یہ حال جو آپ نے اپنے لکھے، اس سے تو صاف ظاہر ہو گیا کہ ابھی یہ حال نصیب بندہ نہیں ہوئے، حق تعالیٰ مبارک فرمائے اور بندہ کو بھی حاصل ہو جائے۔ آمین" (۲)

---

(۱) اس خاندان سے متعلق [illegible] اس خاندان کے چند ارباب علم و ارشاد کا مختصر احوال "[illegible]" (تذکرہ مولانا محمد شفیع [illegible]) ۱۳۵۱ھ/۱۹۳۲ء میں ہے۔

(۲) [illegible] حضرت گنگوہی کے حافظ وحیدالدین صاحب [illegible]

toobaa-elibrary.blogspot.com

ایک اور مفصل گرامی نامہ میں فرماتے ہیں

”اور وہ کیفیت یہ ہے، کہ اپنے آپ کو روبرو مالک معبود کے جانے اور شرم وحیا طاری ہو جائے، اس کا نام حضور اور یادداشت ہے، اسی کو لسان شرع میں احسان کہتے ہیں اور یہی نسبت معتبرہ ہے، کہ حاصل آتی ہے۔ جب اس کا ملکہ خوب ہو جائے، تو یہی امر ہے کہ قابل اجازت تلقین کے بناتی ہے اور اس کا ہی نام ذکر قلبی ہے، اور اس سے پہلے سب مقدمات اس کے ہیں۔ مبارک ہو، پھر مبارک ہو! حق تعالیٰ اس میں ترقی فرمائے اور متمکن فرماوے، بہت شکر کی جگہ ہے، بہت بہت شکر کرنا واجب ہے۔“( )

حافظ وحید الدین صاحب کے احوال وتاریخ وفات وغیرہ معلوم نہیں۔

مولانا وحید الدین رامپوری نے حضرت حاجی امداد اللہ کے مکتوبات کا ایک مجموعہ سنہ ۱۳۰۴ھ (۸۷-۱۸۸۶ء) میں مرتب کیا تھا، حضرت تھانوی نے اس کو، اردو ترجمہ مختصر حواشی اور ضروری معلومات کے ساتھ مرتب کر کے، مرقومات امدادیہ کے نام سے، امداد المشتاق کے ساتھ شامل کر کے ۱۳۳۲ھ میں شائع کر دیا تھا۔ حافظ صاحب کے فرزند مولانا سعید الدین تھے۔

ولادت اور تعلیم: مولانا سعید الدین کی تاریخ ولادت معلوم نہیں، نو عمری سے دینی تعلیم کا آغاز ہوا، جب حضرت حاجی امداد اللہ کو اس کی خبر ملی تو اس پر اظہار مسرت کیا، دعاؤں سے نوازا، اور تحریر فرمایا کہ

”برخوردار احمد وسعید وغیرہ کے عربی پڑھنے سے بھی فقیر کو فرحت ہوئی، اللہ تعالیٰ ان کو علم نافع اور عمل صالح نصیب کرے، اور عمر دراز اور صاحب قدر کرے۔“(۲)

حضرت کی دعا بارگاہ الٰہی میں منظور ہوئی، اور مولانا سعید الدین کو وہ تمام نعمتیں حاصل ہوئیں، جن کے لئے حضرت حاجی امداد اللہ صاحب نے دعا فرمائی تھی۔

مولانا سعید الدین، حضرت مولانا گنگوہی کے ممتاز شاگرد اور جید فاضل تھے، مولانا سعید الدین کے، سبق دورۂ حدیث شریف کا ۲۱ رشوال ۱۳۰۴ھ (جولائی سنہ ۱۸۸۷ء) میں آغاز ہوا تھا، غالباً شعبان ۱۳۰۵ھ میں درس مکمل ہو ہوگا(۳) تعلیم سے فارغ ہو کر متعدد مدرسوں سے وابستہ رہے، سنہ ۳۶-۱۳۳۵ھ (۱۹۱۶-۱۷ء) میں بھوپال چلے گئے تھے، بھوپال میں محرر کی حیثیت سے تقرر ہوا، محنت و دیانت کی وجہ سے تیزی سے ترقی ہوتی رہی، آخر میں مہتمم سرکل، کے اعلیٰ ترین عہدہ تک

(۱) مکاتیب رشیدیہ، مرتبہ مولانا عاشق الٰہی میرٹھی۔ ص ۹۵ طبع دوم، میرٹھ] مولانا سعید الدین رامپوری کے نام
(۲) مرقومات امدادیہ [مشمولہ امداد المشتاق] مکتوب ۵۵۔ ص ۱۰، مرتبہ حافظ وحید الدین رامپوری عاشیہ
(۳) آپ بیتی شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی ص ۔۔ طبع اول (مکتبہ یحیوی سہارنپور ۔۔ ۱۴ھ)

ریاست میں بہت عزت و وقار کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے، ہر طبقہ کے افراد میں پذیرائی حاصل تھی۔

اگرچہ ملازمت کی مصروفیات بہت زیادہ تھیں مگر مولانا نے کبھی بھی قیام ہوا اور کسی بھی ملازمت و خدمت پر فائز رہے درس حدیث کا معمول باقاعدہ جاری رکھا، طلبہ کی مالی معاشی سرپرستی فرماتے، ان کی ضروریات کا بھی بہت خیال کرتے تھے، دو چار طلبہ کو اپنے ساتھ کھانے میں شامل رکھتے تھے۔ معروف اہل قلم محمد امین زبیری نے (جنہوں نے مولانا کو قریب سے دیکھا تھا) لکھا ہے

"وہ دورے میں ہوں یا مقیم ہوں، صبح کے وقت دو چار طلبہ کو حدیث و فقہ کا درس، ان کا لازمہ زندگی تھا، ان کے دسترخوان پر چند طلبہ خصوصاً ناشتہ اور شب کے کھانے کے وقت ضرور ہوتے تھے، وظیفہ یاب ہونے کے بعد بھی یہی نظام وقت تھا" ( )

مولانا وحید الدین کے حضرت مولانا گنگوہی سے جو روابط تھے، مولانا سعید الدین میں اس کا پورا اثر آیا، اور مولانا بھی ہمیشہ حضرت مولانا کے دامن فیض سے وابستہ رہے۔ مولانا سعید الدین کے نام حضرت مولانا کے مکتوبات سے ان روابط اور تعلق کا اندازہ ہوتا ہے، جو حضرت مولانا کو مولانا پر تھا۔ حضرت مولانا کے گرامی ناموں سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ مولانا حضرت کو اپنے تمام معاملات و مسائل سے باخبر رکھتے تھے اور حضرت مولانا حسب ضرورت ہدایت و رہنمائی بھی فرماتے رہتے تھے، حضرت مولانا کے مکتوبات کے بعض مندرجات سے مولانا کے روحانی کمالات و مرتبہ کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ حضرت مولانا نے ایک خط میں تحریر فرمایا ہے

"اگرچہ تم کو ایسی حالت میں کہ اسباب ظاہری پر نظر نہیں، کچھ لکھنا لغو ہے، مگر تاہم بحکم الدین النصیحۃ لکھتا ہوں کہ بار بار زیارت وطن اور بہ شہ و بیداری حقوق، تدبیر کے خلاف ہے، اگر حق تعالیٰ نے سامان رزق مقرر کر دیا ہے، اس کو بتغییر متغیر بنانا اور پریشانی عیال کا سبب ٹھہرانا قرین مصلحت نہیں، آئندہ جو مناسب جانو" (٢)

دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے رکن: مولانا سعید الدین صاحب کو حضرت مولانا گنگوہی کی نسبت اور خاندان حضرت مولانا قاسم نانوتوی سے قرابت کی وجہ سے دارالعلوم دیوبند سے والہانہ سا تعلق تھا، دارالعلوم میں حضرت گنگوہی کی سرپرستی کے آغاز کے وقت سے معمول چلا آرہا تھا کہ رامپور، گنگوہ وغیرہ سے خانوادہ کا کوئی فاضل مدرسہ کی شوریٰ کا رکن بنایا جاتا تھا، سب سے پہلے ممبر مولانا حکیم ضیاء الدین رامپوری تھے، پھر ان کے بھتیجے مولانا حافظ احمد رامپوری اس کے لئے نامزد کئے گئے، مولانا احمد کی رکنیت شوریٰ سے (٣) چار سال بعد ١٣٢٣ھ میں مولانا سعید الدین بھی مجلس شوریٰ کے لئے

(١) [illegible] (طبع اول ١٩٩٦ء)

(٢) مکاتیب رشیدیہ ص ٩٢ (٣) دارالعلوم کی صد سالہ زندگی، تالیف مولانا قاری محمد طیب صاحب ص ١٠٣ (طبع اول دیوبند ١٣٨٥ھ)

toobaa-elibrary.blogspot.com

منتخب کرلئے گئے تھے، جو اس وقت سے وفات تک، بہت دلچسپی اور اہتمام سے مدرسہ کی بھرپور خدمت کرتے رہے۔

شوریٰ کے اجلاس کا وقت آتا، تو کئی دن پہلے دیوبند پہنچتے، مدرسہ کے معاملات کو دیکھتے، کاغذات کو جانچتے اور مجلس شوریٰ میں رکھنے کے لئے ان کی ترتیب و تکمیل فرماتے۔ مجلس کی تجاویز لکھنا اور اس کے متعلق تحریری کام انجام دینا، اپنی سعادت سمجھتے تھے اور کئی دن تک اس میں مشغول، وقت گذارتے تھے۔ دارالعلوم دیوبند کی روداد میں مولانا کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے

"دارالعلوم کی خدمت میں شغف کا حال یہ تھا، کہ مجلس شوریٰ کے ہونے سے چند روز پیشتر آپ تشریف لاتے تھے، اور وہ تمام کاغذات، جو شوریٰ میں پیش ہونے والے ہوتے تھے، آپ ان کو مرتب فرمایا کرتے تھے۔ جلسہ کے دوران میں، تمام روداد شوریٰ کا لکھنا، تجاویز کا مسودہ بنانا اور بعد میں ان کا صاف کرنا، یہ سب کچھ آپ نے اپنے ہی ذمہ لے رکھا تھا، آپ ان تمام کاموں کو عبادت عظمیٰ خیال فرماتے تھے اور کبھی تحدیث بالنعمۃ کے طور پر، اس کا اظہار بھی فرمایا کرتے تھے، اپنا بیشتر وقت دارالعلوم کی ان ہی خدمت میں گذارتے تھے" (۱)

اخلاق وعادات ومزاج: علم وفضل، دیانت وسچائی اور خوش خلقی میں ممتاز ومعروف تھے، وسیع القلب تھے، ہر کہ فکر وخیال کے افراد سے بے تکلف ملتے اور ضرورت ہوتی، تو نہایت نرمی سے بحث وگفتگو کرتے تعصب اور شدت مزاج سے بہت دور تھے۔ نصیحت وگفتگو نہایت مؤثر تھی، دینی ودنیاوی وجاہت سے بہرہ ور تھے۔ محمد امین زبیری صاحب نے، بھوپال کے ممتاز علماء میں مولانا کا ذکر کیا ہے، جو لائق مطالعہ ہے۔ لکھتے ہیں:

علماء کے زمرہ میں، مولوی سعید الدین کو بھی شامل کرنا چاہئے، جو دیوبند کے فارغ التحصیل تھے۔ بھوپال میں ان کی پوزیشن، ایک سیویلین افسر کی تھی، انہوں نے محرری سے ترقی کی اور ذمہ دارانہ عہدوں پر مامور رہے۔ وہ دورے میں ہوں یا مقیم، صبح کے وقت دو چار طلباء کو حدیث وفقہ کا درس، ان کا لازمۂ زندگی تھا۔ ان کے دسترخوان پر چند طلباء، خصوصاً ناشتہ اور شب کے کھانے کے وقت ضرور ہوتے تھے، وظیفہ یاب ہونے کے بعد بھی یہی نظام اوقات تھا۔

نہایت وجیہ، خوش لباس اور نفیس طبع تھے۔ ایسے پیرایہ میں نصیحت کرتے تھے کہ مؤثر ہوجاتی تھی وسیع القلب تھے، ہر خیال کے آدمی سے مخلصانہ و بے تکلفانہ ملتے تھے اور نرمی سے بحث کرتے تھے، متعصبانہ ذہنیت کا پتہ نہ تھا۔ شرعی پائجامہ (جس کا کمربند گلے میں ہوتا یا اس میں پتلون کی گیٹس لگے ہوتے) قمیص، شیروانی اور ترکی ٹوپی پہنتے تھے، کبھی کبھی مولویانہ عمامہ اور قبا بھی، بلیرڈ اور کروکے کھیلوں میں مشاق تھے (۲)

(۱) روداد دارالعلوم دیوبند ۱۳۲۷ھ

(۱) بھوپال کا علمی جائزہ، مضمون از محمد امین زبیری، مشمولہ بھوپال نمبر، فکر و آگہی، دہلی، مرتبہ شیخ حامد صاحب، ص: ۲۹۱ (طبع اول ۱۹۹۶ء)

toobaa-elibrary.blogspot.com

مولانا کا مرتبہ حاشیہ مکتوبات امدادیہ: مولانا کی ایک مختصر علمی تحریری خدمت، حضرت حاجی امداد اللہ کے مجموعہ مکتوبات (مرقومات امدادیہ) میں درج شخصیات کا تعارف ہے۔ یہ مجموعہ مکتوبات مولانا کے والد مولانا حافظ وحید الدین صاحب نے مرتب کیا تھا۔ حضرت مولانا تھانوی نے مولانا سعید الدین سے اس میں مذکور شخصیات وعلماء وغیرہ کی تعیین کرائی اور مولانا عبد الغنی حیدرآبادی نے ان مکتوبات فارسی کا ترجمہ کر کے مرقومات امدادیہ کے نام سے امداد المشتاق کے ساتھ شائع فرمایا۔ مولانا اشرف علی تھانوی نے اس خدمت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

"ان مکتوبات میں بہت سے حضرات کے اسمائے گرامی اس طرح آئے ہیں کہ فہم مضامین ان کے حالات معلوم ہونے پر موقوف ہے، بنا بریں جناب مولانا سعید الدین صاحب ابن مولانا محمد وحید الدین صاحب، جامع مکتوبات سے ان حضرات کے مختصر حالات تحریر فرمانے کی استدعا کی گئی، ممدوح نے نہایت خوشی سے اس کو منظور فرمایا(۱)

وفات: مولانا سعید الدین کی بھوپال میں ۲۳ ذی قعدہ سنہ ۱۳۴۷ھ (۳ مئی سنہ ۱۹۲۹ء) کو وفات ہوئی (۲) وہیں دفن کئے گئے۔ علمی دینی حلقوں میں مولانا کی وفات کا گہرا صدمہ ہوا۔ مولانا سے جو ایک فیض جاری تھا، اس کے ختم ہونے پر تاسف ظاہر کیا گیا۔ دارالعلوم دیوبند نے، جس کی مجلس شوریٰ کے مولانا تقریباً چوتھائی صدی تک رکن رہے، مولانا کی کمی کو بہت محسوس کیا۔ دارالعلوم کی روداد میں مولانا کا تذکرہ ہوا، اور مولانا کی وفات سے مدرسہ کے لئے جو خلا پیدا ہو گیا تھا، اس کا خاص طور سے تذکرہ کیا گیا۔ روداد کا متعلقہ اقتباس درج ذیل ہے

اس حادثہ [مولانا احمد نانوتوی، مہتمم دارالعلوم دیوبند کی وفات] کے چند ماہ بعد ہی حضرت مولانا سعید الدین صاحب مرحوم رامپوری مشیر المہام ریاست بھوپال کی وفات ہوگئی، جس سے مجلس شوریٰ کے کاموں میں زبردست کمی و نقصان اہل جمعیت نے محسوس کیا۔ مولانا سعید الدین صاحب مرحوم رامپوری دارالعلوم کے ان قدیم ممبران میں سے تھے، جو حضرت نانوتوی کے خاص تلامذہ میں سے تھے۔

آپ کی تمام عمر مدرسہ کی خدمت گزاری، ہمدردی و خیر خواہی میں گزری۔ اسی کے ساتھ آپ کا علم و فضل، راست بازی، دیانت داری، نیکی، خوش خلقی و مروت ایسے اوصاف تھے، جن میں آپ یگانہ روزگار سمجھے جاتے تھے۔ اگرچہ آپ کا تعلق ریاست بھوپال میں ہونے سے، بظاہر مشغول رہنے کی وجہ سے خاطر خواہ نہ تھا، مگر باوجود اس کے اس

---

(۱) مرقومات امدادیہ … [illegible] (۱۳۴۲ھ)

(۲) [illegible] … [illegible]

toobaa-elibrary.blogspot.com

زمانہ میں بھی آپ اس مشغلہ سے خالی نہ رہے، ایک دو طالب علم آپ کے مکان پر حاضر رہ کر حدیث، تفسیر اصول فقہ اور فقہ وغیرہ کی بڑی بڑی کتابیں آپ سے پڑھتے رہتے تھے۔

دارالعلوم کی خدمت میں شغف کا یہ حال تھا کہ مجلس شوریٰ کے ہونے سے چند روز پیشتر آپ تشریف لاتے تھے، اور وہ تمام کاغذات، جو شوریٰ میں پیش ہونے والے ہوتے تھے، آپ ان کو مرتب فرمایا کرتے تھے۔ جلسہ کے دوران میں تمام روداد شوریٰ کا لکھنا تجاویز کا مسودہ بنانا اور بعد میں ان کو صاف کرنا یہ سب کچھ آپ نے اپنے ہی ذمہ لے رکھا تھا، آپ ان تمام کاموں کو عبادت عظمیٰ خیال کرتے تھے اور تحدیث نعمت کے طور پر اس کا اظہار بھی فرمایا کرتے تھے، اپنا بیشتر وقت دارالعلوم کی ہی خدمت میں گذارتے تھے۔ فتنہ سنہ ۱۳۴۴ھ میں آپ نے جس سرگرمی سے دارالعلوم کی حمایت و اعانت کی، وہ مخصوص حصہ ہے جس کے لئے القاسم و اخبار شوریٰ کے مقالات شاہد عدل ہیں، آپ کی وفات کا صدمہ، حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب رحمۃ اللہ علیہ و دیگر ارکان مدرسہ اور تمام جماعت دارالعلوم نے غیر معمولی طور پر محسوس کیا اور واقعہ یہ ہے کہ آپ کی وفات سے مدرسہ کی اور مجلس شوریٰ کی قوت انتظامیہ و اہمیت ترتیبیہ کو جو نقصان عظیم پہنچا، اس کی تلافی آج تک نہ ہو سکی، فی زمانہ ایسے مخلص کارکن کہاں۔ حق تعالیٰ آپ کی مغفرت فرما کر آپ کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔

دارالعلوم میں جب آپ کی وفات کا تار پہونچا طلبہ و مدرسین و ملازمین نے متعدد قرآن خوانی و کلمہ طیبہ کا ختم کرکے آپ کے لئے ایصال ثواب کیا"(۱)

مولانا سعید الدین بن علیم الدین رامپوری: مولانا سعید الدین کے عہد میں رامپور میں اسی نام کے ایک اور عالم بھی تھے، جو مولانا علیم الدین بن شیخ احمد بخش کے فرزند ارجمند تھے۔ تھانہ بھون کے اس معروف فاروقی خاندان کے فرد تھے، جس سے تھانہ بھون کے مشہور علماء و مشائخ وابستہ ہیں(۲) یہ خاندان سنہ ۱۸۵۷ء کے معرکہ میں تھانہ بھون کی بربادی کے بعد رامپور آکر آباد ہوگیا تھا۔

مولانا سعید الدین کی نسبت مولانا کی تحریروں سے چند مختصر سی ناتمام معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ مولانا سعید الدین مفتی عبد القیوم بڈھانوی سے بیعت تھے(۳) ان کا کچھ دنوں بھوپال میں بھی قیام رہا تھا۔ مولانا سعید الدین کو ہندوستان کی

---

(۱) روداد دارالعلوم دیوبند سنہ ۱۳۴۴ھ ص ۷۔

(۲) مولانا علیم الدین فاروقی کا، ان کے جدی سلسلہ نسب نامہ [illegible] کے ساتھ شامل ہے۔ [illegible]

(۳) مولانا عبد القیوم سے بیعت کا تذکرہ [illegible] مفتی عبد القیوم صاحب کی [illegible] سے بیعت بھی [illegible] مولانا سعید الدین نے اپنی تحریرات میں [illegible] ان کی مذکورہ تحریروں کے فوٹو [illegible] ہمارے ذخیرہ میں موجود ہیں۔

toobaa-elibrary.blogspot.com

شرعی حیثیت کے بحث سے دلچسپی تھی، مولانا نے مولانا قاضی محمد ایوب پھلتی کا رسالہ دارالحرب بھی ۱۳۰۰ھ میں نقل کیا تھا [یہ نسخہ مظاہر علوم سہارنپور کے کتب خانہ میں موجود ہے۔] ۱۳۲۲ھ (۱۹۰۴ء) تک حیات تھے۔

مولانا کو فقہ حنفی سے ذوق تھا، شامی پر مولانا کے مختصر اشارات وافادات درج ہیں۔ مولانا کے تعلیم وتلمذ وغیرہ کے متعلق کچھ معلوم نہیں اور مولانا کے حضرت مولانا گنگوہی سے کسی رابطہ کی بھی ہنوز کوئی اطلاع دستیاب نہیں، اس لئے قرین قیاس ہے کہ حضرت مولانا گنگوہی کے نام سوال اور مکتوب، مولانا سعید الدین خلف مولانا وحید الدین کا ہے۔ بظاہر مؤخر الذکر، مولانا سعید الدین (ابن حکیم مدین) کا اس فتوے سے کچھ تعلق نہیں۔

اس فتوے کے قلمی نسخے: اس فتوے کی گرچہ تحریر کے فوراً بعد نقلیں شروع ہوگئی تھیں، خود حضرت مولانا گنگوہی نے اپنے فتوے کے آخر میں تحریر فرمایا ہے: میں یہ مسودہ بھیج رہا ہوں امید کہ اس کی نقل لینے کے بعد اصل تحریر یہاں واپس بھیج دیں گے، کیوں کہ یہاں بھی کچھ لوگ اس کی نقل کا ارادہ رکھتے ہیں۔

"این مسودہ را روانہ کردم، امید کہ بعد نقلش، مودت این صوب فرمایند کہ بعض مردم این جا، ہم قصد نقلش می دارند"

حضرت کے تلامذہ ومتوسلین کا معمول بھی یہی تھا، کہ وہ حضرت مولانا کی اکثر اہم تحریروں اور فتاویٰ کی نقل محفوظ کرنے کی کوشش کرتے تھے، بظاہر اس پر بھی متعدد حضرات نے توجہ فرمائی ہوگی، یہی وجہ ہے کہ حضرت کی وفات کے ایک عرصہ بعد تک اس کی متعدد نقلیں موجود تھیں۔ مولانا مفتی محمد شفیع نے مطبوعہ نسخہ کی تمہید میں لکھا ہے:

"حضرت کے اقارب وتلامذہ میں، دوسرے متعدد حضرات کے پاس بھی، اس کی نقلیں موجود ہیں"

مگر افسوس کہ اب ان میں سے اکثر نقلیں معدوم اور بے نام ونشان ہوچکی ہیں، صرف دو قدیم ومعتبر قلمی نسخے معلوم ہیں، پہلا حضرت مولانا گنگوہی کے ایک پرانے شاگرد اور مجاز طریقت، مولانا صادق الیقین صاحب کرسوی (۱) کی باقیات تلامذہ

---

(۱) مولانا صادق الیقین خلف مولانا [illegible] ... حکیم محمد حسین ... حضرت مولانا شاہ ... علی تھانوی ... [illegible] ... مولانا محمد صدیق احمد کاندھلوی ... [illegible] ... حضرت مولانا رشید احمد کی خدمت میں گنگوہ میں حاضر ہوئے ... حضرت مولانا سے حدیث شریف مکمل ... [illegible] ... کیا کرتے تھے۔

ان ... حضرت صادق ... حاصل کیا ... قرآن کریم ... تجوید میں کمال حاصل کیا ... حدیث اور ... حضرت مولانا گنگوہی کی خدمت میں ... [illegible] ... حضرت مولانا ... خلافت حاصل (رشیدی) ... [illegible] ... کامل تھے۔

[illegible] ۱۳۳۳ھ (ستمبر ۱۹۱۵ء) میں ہجرت ... مکہ معظمہ ... ۱۳۳۴ھ (نومبر ۱۹۱۵ء) مکہ معظمہ میں وفات ہوگئی، معلومات ... [illegible] ... ۱۳۳۳ھ ... (سفرنامہ حج خدا بخش ... [illegible]) ... [illegible] ... ۱۹۹۲ء ... [illegible]

چند کتابوں میں شامل ہے، دوسرا نسخہ جو علامہ انور شاہ کشمیری کے قلم سے ہے وہ خانقاہ رحمانیہ مونگیر (بہار) میں محفوظ تھا، اس نسخہ کا عکس مولانا منت اللہ مونگیری نے "ہندوستان اور دار الحرب" کے نام سے شائع کرایا تھا۔ دونوں کا تعارف درج ذیل ہے

نسخۂ کرسی، مکتوبہ ۱۳۲۲ھ: اس فتوے کا خانقاہ نجیبیہ کرسی (ضلع بارہ بنکی) میں موجود نسخہ قدیم ترین معلوم ہوتا ہے۔ یہ ایک مجموعہ (تحریرات و رسائل) میں شامل ہے جو حضرت مولانا گنگوہی کے چند اہم ترین جوابات و مکتوبات پر مشتمل ہے۔ اس مجموعہ کا تصنیف، اصطلاحات تصوف اور مشائخ صوفیہ سے متعلق خلیفہ ابو محمد محی الدین کے ایک مفصل سوالات اور اس کے نہایت جامع جواب سے آغاز ہوا ہے، اس کے بعد حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کی حضرت مولانا سے دو ایک خط و کتابت نقل کی ہے، جو بعد میں تذکرۃ الرشید میں شائع ہوئی تھی۔ علاوہ ازیں یہ فتویٰ اور اس کا سوال نامہ نقل کیا گیا ہے، جو صفحہ ۳۵ کے نصف آخر سے صفحہ ۴۳ کے ختم تک (اس طرح آٹھ صفحات پر) مشتمل ہے، آخری ڈیڑھ صفحہ میں تجدید بیعت کے سلسلہ میں مولانا احمد حسن امروہوی کے ایک سوال کا جواب نقل ہے، گویا یہ مجموعہ کل سینتالیس صفحات میں ہے۔ تحریر پختہ مگر رواں ہے، ترقیمہ کاتب درج نہیں، لیکن صفحہ ۱۸ کے حاشیہ پر یعنی خلیفہ ابو محمد محی الدین کے سوال کے جواب کے اختتام پر، کاتب نے اپنا نام و سنہ کتابت لکھا ہے۔

"بقلم ناچیز محمد احمد عفی عنہ   المرقوم، ۲۷ ذو القعدہ ۱۳۲۲ھ یوم پنجشنبہ وقت ۷ بجے صبح"

فی صفحہ سترہ سے بیس تک سطریں ہیں، پہلے سترہ صفحات کے حواشی پر خلیفہ ابو محمد محی الدین کے سوالات کا جواب نقل ہوا ہے، درمیان سے دو تین کے علاوہ اکثر صفحات کے حاشیے سادہ ہیں۔

نسخۂ مونگیر، مکتوبہ بدست حضرت علامہ انور شاہ کشمیری: اس فتوے یا رسالہ کا ایک دوسرا نسخہ شہرۂ آفاق جلیل القدر عالم اور محدث، علامہ انور شاہ کشمیری کے قلم سے، خانقاہ رحمانیہ مونگیر، کے ذخیرہ میں محفوظ تھا، اس ذخیرہ کا یہ نسخہ مولانا عبد الماجد صاحب (کمراؤں ضلع دربھنگہ، بہار) کی خانقاہ کی۔ بہر کیف کو عنایت کی ہوئی، مستودات میں شامل ہے۔ مولانا منت اللہ رحمانی صاحب نے اس نسخہ کا عکس، خانقاہ مونگیر سے سنہ ۱۳۸۳ھ (۶۴-۱۹۶۳ء) میں بعنوان ... شائع کرایا تھا۔ طباعت صرف آٹھ صفحات پر مشتمل ہے، پہلا صفحہ سرورق کا ہے، دوسرے پر کتب خانہ رحمانیہ کا فوٹو ہے، تیسرے چوتھے صفحہ پر، مولانا منت اللہ رحمانی کے قلم سے، اس نسخہ کی وجہ طباعت اور اس کا تعارف "تقریب" کے عنوان سے درج ہے۔ تین صفحات پر حضرت شاہ صاحب کا مکتوبہ نسخہ یا فتویٰ آیا ہے، آخری صفحہ سادہ ہے۔ مگر تعجب ہے کہ مولانا منت اللہ رحمانی نے اس کو حضرت شاہ صاحب کی تالیف سمجھا ہے اور اسی حیثیت سے شائع بھی کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

"میری خوش نصیبی ہے کہ حضرت (علامہ انور شاہ کشمیری) کی ایک علمی تحریر جس کا تعلق ہندوستان کے دار الحرب

ہونے سے ہے، آپ کے یک لائق شاگرد جناب مولانا عبدالماجد صاحب کمروی ضلع دربھنگہ کے ذریعہ حاصل ہوئی والحمدللہ کہ آج اس کی اشاعت کی سعادت نصیب ہو رہی ہے

حضرت شاہ صاحب نے اپنی اس تحریر میں، سب سے پہلے، کسی ملک کے دارالاسلام یا دارالحرب ہونے کی اصل وبنیاد بیان کی ہے"

سمجھ میں نہیں آتا کہ مولانا منت اللہ رحمانی صاحب جیسے جید فاضل اور ماہر عالم کو، اتنا بڑا مغالطہ کس طرح ہوا، یا تو مولانا رحمانی صاحب، حضرت مولانا گنگوہی کے اس فتوے سے واقف ہی نہیں تھے، یا اس کا مطبوعہ نسخہ دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا، ورنہ ایسا دعویٰ نہ فرماتے، جس کا ثابت کرنا ممکن نہیں۔ بلاشبہ یہ تحریر یا فتویٰ، حضرت علامہ انور شاہ کے قلم سے ہے، مگر یہ حضرت علامہ کی اپنی تالیف یا فادہ نہیں ہے، بلکہ حضرت علامہ نے، ان صفحات میں حضرت مولانا گنگوہی کا وہی معروف فتویٰ نقل کیا ہے، جو بعد میں مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کے ذریعہ سے شائع ہو کر عام ہوا۔ مولانا رحمانی کی اس فروگذاشت پر مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے متوجہ و متنبہ کیا ہے اور لکھا ہے کہ:

"اس میں تو کوئی شبہ ہی نہیں کہ یہ تحریر لکھی ہوئی حضرت الاستاذ کے ہاتھ کی ہے، لیکن ساتھ ہی اس میں بھی کوئی شک وشبہ نہیں ہو سکتا کہ حضرت الاستاذ اس کے صرف ناقل ہیں، مصنف نہیں، کاتب ہیں صاحب تحریر نہیں، اس بنا پر اس تحریر میں جو کچھ درج ہے اس کو شاہ صاحب کی رائے یا فتویٰ قرار دینا قطعاً غلط ہے(۱)

نسخہ مونگیر اور نسخہ مرتبہ مولانا مفتی محمد شفیع صاحب میں، کوئی بڑا بنیادی فرق نہیں ہے، بلکہ کئی مرتبہ یہ خیال آتا ہے کہ مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کو جو نسخہ ملا تھا وہ غالباً حضرت علامہ کے مکتوبہ نسخہ یا اسی کی اصل پر مبنی ہے، جس سے دونوں نسخے نقل کئے گئے ہیں۔ بہرحال یہ نسخہ جو مولانا منت اللہ نے شائع کیا ہے، نہ حضرت علامہ کشمیری کی تالیف ہے، نہ حضرت مولانا گنگوہی کے مذکورہ فتویٰ کے علاوہ کوئی اور، یہ تحریر ایسا ہی فتویٰ ہے جو حضرت مولانا گنگوہی نے، مولانا سعید الدین کے سوال کے جواب میں تحریر فرمایا تھا۔ مولانا اکبر آبادی نے یہ بھی لکھا ہے کہ:

"آپ حضرت شاہ صاحب کی تحریر کو، حضرت گنگوہی کی تحریر کے ساتھ ملا کر پڑھئے، تو معلوم ہوگا کہ اول سے آخر تک مونٹرا لفظ بلکہ حرف بحرف نقل ہے، فرق اگر ہے تو صرف اس قدر، کہ فتوے کے ناقل، چونکہ حضرت شاہ صاحب خود ہیں اس لئے املا اور کتابت کے اغلاط سے یہ تحریر بالکل پاک وصاف ہے"(۲)

نسخہ مطبوعہ دیوبند اور مطبوعہ مونگیر کے مقابلہ سے یہ حقیقت بالکل بے غبار ہو جاتی ہے کہ دونوں کی اصل ایک ہے اور

(۱) مصدر سابق ——— ملاحظہ ہو ——— "ہندوستان کی شرعی حیثیت" مولانا سعید احمد اکبر آبادی ص ۳۲ (علی گڑھ ۱۹۷۸ء)
(۲) ہندوستان کی شرعی حیثیت ص ۳۳

toobaa-elibrary.blogspot.com

ان دونوں میں جو جزوی اختلاف ہے، وہ راقم سطور نے مرتبہ نسخے کے حاشیہ میں درج دونوں کے اختلافات سے واضح ہو جائے گا۔( )

خلاصہ یہ ہے کہ مؤخر الذکر شائع رسالہ "ہندوستان اور دار الحرب" کا حضرت علامہ انور شاہ کشمیری کے سوا کسی اور کی طرف انتساب درست نہیں، یہ حضرت مولانا گنگوہی کا وہی معروف فتوی ہے اس لئے نسخہ مؤخر کو بھی اس فتوے کے بنیادی نسخوں میں شمار کیا جانا چاہئے۔

طبع اول، دیوبند، ۱۳۵۲ھ: اس فتوی کی پہلی اشاعت وہ ہے، جو مولانا مفتی محمد شفیع عثمانی دیوبندی کے ترجمہ اور حاشیے کے ساتھ اول مفتی صاحب کے رسالہ ماہنامہ المفتی دیوبند میں مضمون کی صورت میں چھپی تھی۔ اس کے بعد "فیصلة الاعلام فی دار الحرب و دار الاسلام المعروف بہ کیا ہندوستان دار الحرب ہے؟" کے نام سے دار التبلیغ دیوبند سے ۱۳۵۲ھ (غرہ جمادی الاولی، اگست و ستمبر سنہ ۱۹۳۳ء) میں کتابی صورت میں شائع ہوئی۔

مولانا مفتی محمد شفیع صاحب نے اس فتوی کا اردو ترجمہ، بعض جوابوں کی مراجعت کی، چند توضیحات اور اضافے، مولانا مفتی محمد سہول بھاگلپوری (۲) صدر مفتی دار العلوم دیوبند نے بھی کئے۔ یہ اس نسخے کی اب تک کی واحد کتابی اشاعت ہے، اگرچہ اس رسالہ یا اشاعت سے نقل ہو کر یہ فتوی اور جگہ بھی چھپے، مگر ان متاخر اشاعتوں پر اعتماد صحیح نہیں۔

مفتی محمد شفیع صاحب کا چھپا ہوا نسخہ سولہ صفحات کا ہے، پہلا صفحہ سرورق کا ہے، دوسرے پر مولانا محمد شفیع کی مرتبہ تمہید ہے، صفحہ ۳ سے ۱۶ تک فارسی فتوی اور ترجمہ اور حاشیے درج کئے گئے ہیں۔ اب اس طباعت کے نسخے بھی کمیاب ہیں، تاہم ہمارے ذخیرہ میں اس طباعت کا صاف ستھرا ایک عمدہ نسخہ موجود ہے (۳)

اس طباعت کے متعلق، مولانا محمد میاں صاحب کی اطلاعات درست نہیں: مولانا محمد میاں صاحب نے اپنی کتاب "علمائے حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے" میں اس فتوے (مطبوعہ دار الاشاعت دیوبند) کا ذکر کرتے ہوئے جو کچھ لکھا ہے، وہ غلط فہمی ہی نہیں بلکہ تہمت کے زمرہ میں آسکتا ہے، مولانا نے لکھا ہے

( ) یہ اختلافات نسخہ زیر نظر طباعت میں درج نہیں کئے گئے، اس سے دو اشاعت ملاحظہ کی جا سکتی ہیں۔ ان کے متعلقات پر مبنی اس متن اور ترجمے کی جلد شائع ہوئی ہے۔ (نور)

(۲) مولانا محمد سہول عثمانی بھاگلپوری ۱۲۸۷ھ (۱۸۷۰-۱۸۷۱ء) میں ولادت ہے، ۱۲ رجب سنہ ۱۳۴۷ھ، ۲۴ دسمبر سنہ ۱۹۲۸ء کو وفات ہوئی۔ مفصل حالات کے لئے دیکھئے حیات مولانا محمد سہول عثمانی بھاگلپوری، مؤلفہ محمد تسنیم عثمانی، فیروزی (کراچی ۱۹۷۶ء)

(۳) یہ نسخہ ... ایک محقق ... مولانا محمد عاشق الٰہی ... صاحب سے قدرے اس کے کرم فرمائی سے ... پر مفصل حاشیے لکھے گئے ہیں۔

”حضرت مرحوم ربانی نے نہایت مبسوط ومدلل فتویٰ فارسی زبان میں تحریر فرمایا، جس کی اشاعت کانگریسی وزارتوں سے پہلے ناممکن رہی۔ اور جیسے ہی (۱۹۳۷ء میں) کانگریس وزارت قائم ہوئی تو بازار کے چلنے والی چیز تصور کرکے اس کو سے بزرگ نے شائع فرمایا، جن کا مسلک اس فتوے کے خلاف ہے۔ پھر آخر میں شمس الہدیٰ پٹنہ کے سابق پرنسپل نے ایک صفحہ کا بے معنی فتویٰ لگا کر مخمل میں ٹاٹ کا پیوند لگا دیا“ (۱)

افسوس کہ مولانا محمد میاں نے اس میں جو کچھ لکھا ہے وہ سراسر ناانصافی اور زیادتی ہے، اس میں جو باتیں کہی گئی ہیں بلاشبہ وہ سب غلط ہیں۔

الف: یہ فتویٰ کانگریس کی وزارت بننے سے چار سال پہلے، سنہ ۱۳۵۲ھ غالباً جمادی الاولیٰ (اواخر اگست، ستمبر ۱۹۳۳ء) میں شائع ہو چکا تھا، کانگریس کی یوپی میں پہلی وزارت، وسط سنہ ۱۹۳۷ء (وسط ۱۳۵۶ھ) کے بعد قائم ہوئی تھی (۲) اس لئے مفتی صاحب کی اس خدمت و اشاعت کو کانگریسی وزارتوں سے جوڑنا ناواقفیت اور بے خبری یا شاید مسلم لیگ اور اس کی جدوجہد سے وابستہ ہونے سے کھلی نفرت اور صاف تعصب پر مبنی ہے۔

ب: مولانا مفتی محمد شفیع نے اس فتوے کو اس کے دینی مفادات کی وجہ سے نہیں، بلکہ بازار کی چلنے والی چیز سمجھ کر شائع کیا تھا۔ حالاں کہ اگر دیکھئے تو اس سولہ صفحہ کی مختصر کتاب کی اشاعت سے مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کو (بشرطیکہ یہ کتاب بہت جلد اور تیزی سے فروخت ہوگئی ہو) زیادہ سے زیادہ دس بارہ روپئے کی بچت ہوئی ہوگی، جو مفتی صاحب کے لئے کوئی بات نہیں تھی، لہذا یہ بات بھی بے جا و نامناسب ہے۔

ج: یہ بھی سراسر لزومی ہے کہ اس فتوے کے مرتب و ناشر (مولانا مفتی محمد شفیع صاحب) کا عمل اس فتوے کے خلاف تھا، بلکہ جس کسی نے حضرت مولانا گنگوہی کے اس موضوع کے فتاویٰ کو توجہ سے پڑھا ہے، وہ جانتا ہے کہ حضرت گنگوہی کا مسلک ہی وہی تھا، جس پر مفتی شفیع وغیرہ کا عمل تھا۔ حضرت مولانا گنگوہی، اس وقت سیاسی تحریکات کے حق میں اور ان کے ہم نوا نہیں تھے۔ بعد میں حالات نے کروٹ لی، اس کی کیا وجوہات و اسباب تھے، وہ ایک الگ بحث ہے۔

د: مولانا محمد میاں صاحب نے مولانا مفتی محمد سہول صاحب کا تعارف بھی اس طرح کرایا ہے، جس سے مفتی صاحب کے غلط تاثر پیدا ہوتا ہے۔ اس فتوے کا حاشیہ لکھتے وقت مولانا محمد سہول دارالعلوم کے اعلیٰ درجہ کے مدرس اور صدر مفتی تھے۔ نیز مولانا محمد سہول، مولانا لطف اللہ علی گڈھی، مولانا احمد حسن کانپوری اور محمد فاروق چڑیا کوٹی کے علاوہ، شیخ الہند مولانا محمود حسن کے بھی خاص شاگرد تھے۔ حضرت مولانا گنگوہی سے تلمذ کی بھی ایک روایت ہے، کثیر استفادہ تو بہرحال ثابت ہے۔ مولانا

(۱) [illegible]

(۲) [illegible]

toobaa-elibrary.blogspot.com

دارالعلوم میں مدرس رہے، اس کے بعد حضرت شیخ الہند کے حسب ہدایت اور مختلف مقامات پر درس دیا۔ مولانا کی شیخ الہند کی ہدایت پر، مدرسہ عالیہ کلکتہ وابستہ ہوئے، پھر شمس الہدیٰ پٹنہ کے پرنسپل کے لئے انتخاب ہوا، پھر دارالعلوم دیوبند کے بلانے پر دوبارہ دیوبند آگئے تھے، لہذا مولانا سہول صاحب کو صدر مفتی دارالعلوم لکھنا چاہئے تھا۔

مولانا محمد سہول صاحب نے اس تحریر میں صرف یہ لکھا ہے کہ، میں نے خود حضرت مولانا گنگوہی سے سنا ہے کہ ”ہندوستان دارالامان ہے“ مولانا سہول نے ساتھ ہی اپنی رائے بھی لکھ دی ہے، کہ ہندوستان سے ہجرت کی ضرورت نہیں۔ اگرچہ صراحت نہیں ملی، مگر قرائن سے واضح ہے کہ ہندوستان کی شرعی حیثیت کے متعلق، حضرت مولانا گنگوہی کی جس زبانی روایت کا، مولانا محمد سہول نے ذکر کیا ہے، وہ دراصل حضرت مولانا گنگوہی کے، اس مفصل فتوے کا حاصل اور ترجمانی ہے جو فتوی مجلس انصار (دارالعلوم دیوبند) کے پہلے سالانہ جلسہ، منعقدہ ربیع الاول سنہ ۱۳۲۹ھ (اپریل ۱۹۱۱ء) میں پڑھا اور سنا گیا تھا، جو مجلس الانصار کی روداد میں بھی شائع کیا گیا تھا، اس وقت تک کابرعلمائے ہند کی متفقہ سے قریب یہی تھی، جو اس فتوے میں درج ہے، اس میں جو تبدیلی آئی وہ بعد کے حالات کا اثر تھا، اس لئے مولانا محمد سہول کی اس رائے اور حاشیہ پر ناگواری، بے محل معلوم ہوتی ہے۔

میرے خیال میں، اس اندراج کے ساتھ ہی، مولانا محمد میاں صاحب کو یہ اعتراف بھی فرمانا چاہیے تھا کہ، مولانا محمد سہول کی ہجرت نہ کرنے کے متعلق، رائے بالکل درست تھی، تحریک ہجرت سے ہندوستان کے مسلم نوجوانوں کو، جو غیر معمولی اور ناقابل تلافی نقصان ہوا اور اس بے مقصد ہجرت کی وجہ سے اعلیٰ تعلیم یافتہ ہزاروں، مسلمان نوجوان جس طرح خانماں برباد ہوئے اس کو برصغیر کی ملی تاریخ کا ایک المیہ ہی کہا جا سکتا ہے۔ اس لئے مولانا محمد سہول کی اس رائے اور حاشیہ پر ناگواری بے محل ہے۔

ہندوستان کی شرعی حیثیت کے حوالہ سے زیر بحث، فتوائے دارالحرب اس موضوع پر حضرت مولانا گنگوہی کا پہلا اور آخری فتوی نہیں ہے، اسی سلسلہ میں حضرت مولانا کے کم سے کم دو فتوے اور معلوم ہیں، جو فتوائے دارالحرب کے بعد لکھے گئے ہیں، یہ دونوں فتوے مفصل فتوے سے خاصے مختلف ہیں، ان میں پہلا فتوی جو نسبۃً مختصر ہے، اس میں حضرت مولانا نے اپنی سابقہ مفصل رائے سے، کسی قدر رجوع فرماتے ہوئے لکھا ہے کہ:

بظاہر تحقیق بندہ کو خوب نہیں ہوئی اور لکھا ہے کہ، اور بندہ کو بھی خوب تحقیق نہیں کہ کیا کیفیت ہند کی ہے۔

یہ مختصر فتوی، فتاوی رشیدیہ کی نئی پرانی تمام اشاعتوں میں شامل ہے۔ فتاوی رشیدیہ کی پہلی دوسری طباعت میں صراحت ہے کہ، حضرت نے یہ فتوی حافظ اللہ دیہ صاحب مقیم بی کوٹھ، ضلع بجنور کے، منجملہ چند سوالات میں سے ایک سوال کے جواب میں تحریر فرمایا تھا۔ یہ سوالات یک جا تھے، حضرت نے اپنے معمول کے مطابق ان کے جوابات بھی، یک وقت

تحریر فرمائے گئے فتوے کی تحریر کی تاریخ حضرت کے قلم سے ۲ ربیع الاول ۱۳۱۲ھ (۷ ستمبر ۱۸۹۴ء) درج ہے۔ اس لئے مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادی کا یہ خیال درست نہیں کہ:

"قیاس کہتا ہے کہ اگر واقعی حضرت گنگوہی کی تحریر ہے بھی، تو فتوے ثانی پر یقیناً برسوں مقدم ہوگی ( )"

لہٰذا یہ بات درست نہیں کہ یہ فتویٰ معروف مفصل فتوے کے بعد کا ہے۔ اس سے صرف یہ معلوم ہو رہا ہے کہ حضرت نے دار الحرب ہونے کی، اپنی رائے پر جلدی نظر ثانی فرمائی تھی، اس خیال یا نظر ثانی کا آغاز اسی مختصر فتوے سے ہوا تھا۔ اس فتوے کے الفاظ یہ ہیں:

سوال: ہندوستان دار الحرب ہے یا نہیں، اگر نہیں تو مولانا محمد اسماعیل صاحب دہلوی نے صراط مستقیم میں کس وجہ سے، حصہ ماقبیہ میں ہند کی نسبت یہ لکھا ہے اور قتنہ سابقہ میں اکثر کابر اعدائے کلمۃ اللہ کی طرف کیوں مائل تھے۔ (۲) اگر مستامنین قرار دیکر رفع امن کو علت کہا جاوے، تو یہ بھی محل تامل ہے۔ بینوا بالتفصیل

الجواب: ہند کے دار الحرب ہونے میں اختلاف علماء کا ہے، بظاہر تحقیق حال بندہ کو خوب نہیں ہوئی، حسب اپنی تحقیق کے سب نے فرمایا ہے دراصل مسئلہ میں کچھ خلاف نہیں اور بندہ کو بھی خوب تحقیق نہیں، کہ کیا کیفیت ہند کی ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔ رشید احمد عفی عنہ گنگوہی (۳)

---

(۱) ہندوستان کی شرعی حیثیت ص ۳۵

(۲) شاہ محمد اسماعیل شہید نے صراط مستقیم میں [illegible] ... [illegible]

[illegible] ص ۴۵ ... [illegible] ۳۸۵ھ)

[illegible] ۱۳۳۳ھ [illegible]

(۳) [illegible] فتاوی رشیدیہ [illegible]

الف [illegible] ۱۳۲۴ھ)

ب [illegible] ۱۳۲۷ھ

ج [illegible] ۱۳۳۳ھ)

[illegible] ص ۵۵ [illegible] ۱۳۲۶ھ)

مذکورہ بالا نسخے نقش ترتیب پر [illegible] ... فتاوی رشیدیہ کی تدوین و ترتیب عمل میں آئی اس ترتیب میں جملہ فتاوی [illegible] ... [illegible] معلوم نہ ہو سکا کہ یہ فتویٰ کس [illegible] ... (۱۹۲۰ء) اور ۱۳۳۹ھ [illegible] میں شائع ہوا تھا۔

[illegible] ... ملاحظہ ہو ص ۵۵، حصہ اول (دہلی ۱۳۲۸ھ)

toobaa-elibrary.blogspot.com

اس مختصر فتوے کے بعد حضرت نے پچھلے گذشتہ فتوے پر مفصل نظرثانی کی بعض مجمل اشارات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مولانا نے (اپنے ایک اہم معمول کے مطابق) اس فتوے کو اشتہار کی صورت میں شائع کر کے تقسیم کر دیا تھا۔ یہ فتویٰ اس کے بعد کم سے کم دو مرتبہ اور چھپا تھا، دوسری اشاعت جو پہلی اشاعت کی طرح اشتہار کی صورت میں تھی، اس پر منجملہ اور علماء کے (شیخ الہند) حضرت مولانا محمود حسن کے بھی تائیدی دستخط تھے۔ مولانا سید اصغر حسین دیوبندی نے سوانح شیخ الہند میں لکھا ہے۔

"حضرت مولانا رشید احمد صاحب قدس سرہ کے نام سے، ایک زمانہ میں بضرورت شرعی، جو فتاویٰ عدم جواز غدر با معاہدین اور حرمت قتل معاہدین کے شائع ہوئے، وہ حضرت مولانا (شیخ الہند) کے تصدیق فرمودہ اور دستخط سے مزین تھے" (۱)

اس فتویٰ کی اہمیت کا اس سے اندازہ کیجئے کہ، اس کو حضرت شیخ الہند کی رہنمائی میں قائم، دیوبند کی ممتاز دینی تنظیم، موتمر الانصار کے، پہلے سالانہ جلسہ ۱۳۲۹ھ (۱۹۱۱ء) کی روداد میں یہ فتویٰ ایک معتمد مشترکہ دستاویز کے طور پر شامل کیا گیا تھا یہی اس کی آخری معتبر اشاعت ہے (۲)

حضرت گنگوہی کا یہ آخری فتویٰ، غالباً ۱۳۲۰ھ (۱۹۰۲ء) سے پہلے کا ہے۔ جس وقت تک برطانوی حکومت اپنے ان معاہدوں اور اعلانات کی پابند تھی، کہ وہ مسلمانوں کے مذہبی معاملات میں مداخلت نہیں کرے گی اور مسلمانان ہند حکومت کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھائیں گے۔

جب تک برطانوی حکومت نے اس کی پاسداری کی، مسلمان بھی اس کے پابند رہے، اور جب خود اصل فریق نے اس کی عملاً ان خلاف ورزی شروع کر دی، اپنے طے کیے ہوئے تمام معاہدوں کو کالعدم کرتے ہوئے تمام اصولوں اور معاہدوں کو توڑ دیا اور خصوصاً مسلمانوں کے مقدس مقامات پر دست درازی شروع کر دی، اس وقت علمائے ہند نے بھی اپنے فیصلہ پر نظرثانی کی ضرورت سمجھی، اس وقت انگریز کے خلاف تحریری بیان کے علاوہ، فتاویٰ اور عملی میدانی جدوجہد کی بھی دوبارہ ترتیب وتشکیل کی گئی۔ یعنی علماء کرام نے یہ قرآنی اصول پیش نظر رکھا تھا کہ

إِنْ أَحْسَنتُمْ أَحْسَنتُمْ لِأَنفُسِكُمْ وَإِنْ أَسَأْتُمْ فَلَهَا (بنی اسرائیل :۷)

اگر بھلائی کی تم نے بھلا کیا اپنا، اور اگر برائی کی تو اپنے لئے (ترجمہ شیخ الہند)

مگر حضرت مولانا گنگوہی، ان معاملات سے برسوں پہلے، ۱۳۲۳ھ (اگست ۱۹۰۵ء) میں وفات پا چکے تھے، اس لئے اس کے بعد، اس موضوع پر حضرت کے قلم سے کوئی اور فتویٰ نہیں آیا۔ یہی فتویٰ اس سلسلہ میں حضرت مولانا کی آخری رائے ہے۔

(۱) حیات شیخ الہند مولانا سید اصغر حسین دیوبندی ص ۲۲۰ (لاہور ۱۹۷۷ء)
(۲) روداد جلسہ اول موتمر الانصار مراد آباد شعبان ۱۳۲۹ھ ص ۲۰۰ (مطبع قاسمی دیوبند)

نیز اس فتوے کی وجہ سے، حضرت مولانا گنگوہی پر جلد رائے بدلنے کا اعتراض بھی بے محل ہے، یہ فتاویٰ کے تضاد یا عدم اطمینان واستقلال کی بات نہیں، بلکہ درحقیقت یہ اس وقت کے سیاسی حالات اور برطانوی حکومت کے قول وعمل کا تضاد تھا، جس کی وجہ سے متعلقہ مسائل اور ان کا جواب بھی متاثر ہو کر تبدیل ہوئے۔

حضرت مولانا کے فتووں کے اس اختلاف کا تذکرہ کرتے ہوئے، مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے جو کچھ لکھا ہے، وہ بھی یہاں پیش نظر رہنا چاہیے مولانا کہتے ہیں:

"جب حالات ذرا بہتر ہوئے مگر مطلع بالکل صاف نہیں ہوا تھا، تو مولانا کو اب پہلی رائے پر اصرار تو نہیں رہا، لیکن ساتھ ہی کھل کر دارالحرب ہونے کی نفی بھی نہیں کر سکے، جیسا کہ فتویٰ رشیدیہ میں ہے کسی قطعی بات کے کہنے سے معذرت فرمادی۔ پھر جب حالات اور زیادہ بہتر ہوئے، امن وامان مکمل طور پر بحال ہو گیا اور مذہبی فرائض ومعمولات بلا خوف وخطر ادا ہونے لگے تو اب حضرت گنگوہی نے اس کو دارالامان ہی قرار دیا" (۱)

حضرت مولانا گنگوہی کی پوری زندگی، اس کی گواہ ہے کہ حضرت مولانا مسائل شرعیہ کی تحقیق وتحریر میں، صرف اور صرف خدمتِ شریعت کو سامنے رکھتے تھے، اگر کسی مسئلہ پر کسی بھی وجہ سے رائے تبدیل ہوتی تو اس کا بھی اظہار واعلان فرما دیتے تھے۔

اگرچہ حضرت مولانا نے برطانوی نظم حکومت میں، اسیر مملکت ہند کے دارالحرب ہونے کا مفصل فتویٰ صادر فرمادیا تھا، مگر بدلتے حالات کے تناظر، وسیع مطالعہ اور ملک میں جاری، حکومت کے اعلانات وقوانین کی وجہ سے، جلد ہی یہ قیاس ہو گیا تھا کہ اس ملک کی واقعی حیثیت اب وہ نہیں رہی جس کا اس فتوے میں اظہار ہوا ہے، اس لئے حضرت مولانا کو اپنی تازہ رائے کا اعلان واظہار کرنے میں ذرا بھی تامل نہیں ہوا، کیونکہ ان کے یہاں فتویٰ کی بنیادی مقصد منافع پر مبنی تھا نہ ہے۔ حضرت مولانا کا اصول یہ تھا کہ جو مسئلہ معلوم ہے اس کی وضاحت شرعی مجھ پر ضروری ہے، ایک فتوے کے ضمن میں اپنے اس نظریہ کا اظہار کرتے ہوئے لکھا تھا کہ

"بندہ مفتی ہے، مسئلہ حق جو اپنے نزدیک ہوتا ہے، اس کو بتانا فرض ہی جانتا ہوں" (۲)

اس فتوے کا ذکر آیا ہے تو یہ صراحت بھی ضروری ہے کہ مجلس الانصار کے اجلاس، مراد آباد (۱۳۲۹ھ—۱۹۱۱ء) کو زیادہ وقت نہیں گذرا تھا، ہندوستان کے سیاسی حالات میں یکلخت غیر متوقع تبدیلی آ گئی، اس اجلاس کے وقت تک ہندوستان میں ایک متوازن اور بڑی حد تک غیر جانبدارانہ حکومت کارفرما تھی، جس کے تحت مذہبی معاملات میں ہر ایک کے لئے کامل آزادی، تعلیم ملازمت اور ترقی کے مواقع پر سب کے لئے یکساں ضوابط اور کسی بھی قوم کے مذہبی معاملات میں، مداخلت نہ کرنے کے اصول بنیادی حیثیت رکھتے تھے جس کی وجہ سے ملک طبقہ اس وقت برطانوی حکومت کو ایک ناگزیر حقیقت سمجھ کر،

(۱) ہندوستان کی شرعی حیثیت ص ۴۴

(۲) ... حضرت ... (مجموعہ ... خبر ...) فتاویٰ رشیدیہ ص ۱۳۰ حصہ دوم (طبع اول مراد آباد ۱۳۲۳ھ)

toobaa-elibrary.blogspot.com

اور اپنے مذہب اور وسائلِ معاش کی طرف سے کس حد تک مطمئن ہو کر سیاسی معاملات و مسائل سے تقریباً بے تعلق ہو گیا تھا، اور موقع بہ موقع سرکار سے اپنی وفاداری کا اظہار کرتا رہتا تھا، یہاں تک کہ برصغیر کے عام باشندوں کی ترجمان، سمجھی جانے والی تنظیم کانگریس بھی اسی راہ کی مسافر تھی، وہ بھی پوری طرح انگریز حکومت کی ہم نوا اور وفادار تھی، اور ہر موقع پر وفاداری سرکار کے علامات میں پیش پیش رہتی تھی (۱)

اگرچہ کانگریس ۱۸۸۵ء (۱۳۰۳ھ) میں قائم ہو گئی تھی، مگر کانگریس کے کسی جلسہ میں برطانوی حکومت کے حالات پر کھلا تبصرہ، یا ہندوستانیوں کے سیاسی مفادات کے لئے آزادی، کانگریس کے قائم ہونے کے تقریباً بیس سال بعد، ۱۹۰۷ء (۱۳۲۵ھ) میں پہلی مرتبہ کی گئی تھیں، لیکن اس وقت بھی کانگریس کے ایک حلقہ نے اس طرز عمل کی مخالفت کی تھی، جس پر کانگریس دو گروپوں میں تقسیم ہو گئی تھی (۲)، کانگریس کے قیام کے تیس سال کے بعد تقریباً ۱۹۱۵ء میں اس پر اتفاق رائے ہوا تھا کہ کانگریس کو ملک کے باشندوں کے لئے آزادانہ آواز اٹھانی چاہئے۔ جب ملک کی سب سے بڑی اور اہم مقاصد کے لئے قائم تنظیم (کانگریس) کا یہ حال تھا کہ وہ لمبے عرصہ تک سیاسی حقوق کے لئے کوئی آواز بلند نہ کر سکی، تو جو لوگ سیاسی میدان میں موجود ہی نہیں تھے، ان سے اس وقت ایسے سیاسی اقدامات کی امید نہیں کرنی چاہئے۔

اور اگرچہ شروع سے کچھ مسلمان بھی، کانگریس کے ہم نوا تھے اور اس سلسلہ میں حضرت مولانا گنگوہی کا ایک فتویٰ یا مکتوب بھی شائع ہو چکا تھا، مگر ہندوستان کے مسلمانوں میں ۱۸۵۷ء کی باقی ماندہ چنگاریاں، اس وقت شعلہ بن کر نمودار ہوئیں، جب ہندوستان پر قابض حاکم طبقے نے، پوری دنیا کے مسلمانوں کی دل آزاری اور خلافت اسلامیہ ترکی کو برباد کرنے کے لئے بڑے بڑے اقدامات کئے اور ہندوستانی قائدین اور مسلمانوں کو انگریزوں کی اسلام دشمنی میں کئی بڑی بڑی سازشوں کا پتہ چلا اور برطانیہ کی حکومت نے، اپنے باقاعدہ معاہدوں کی کھلی خلاف ورزی شروع کی اور خلافت عثمانیہ سے کئے گئے تمام معاہدوں کو یک طرفہ توڑ دیئے۔

یہ بلقان کی دوسری جنگ تھی، جس کی حرارت سے مسلمانانِ عالم کے دل سوختہ اور مضطرب تھے، اس کی وجہ سے مسلمان رہنما بھی، اپنے تمام پرانے معاہدوں اور معاملات پر نظر ثانی کر کے یہ فیصلہ کرنے پر مجبور ہو رہے تھے، کہ اس وقت پوری دنیا میں اسلام اور مسلمانوں کا برطانیہ سے بڑا دشمن کوئی نہیں، جس کے یہاں نہ کسی معاہدہ کا پاس ہے، نہ اپنی زبان اور قول و قرار کا خیال،

بالکل ایسے ہی حالات تھے، جیسے آج کل ہیں کہ پورا عالم اسلام اور مسلم دنیا امریکہ کے مظالم کی چکی میں، مسلسل پس رہی ہے مگر ...

(۱) کانگریس کا دوسرا جلسہ ۱۸۸۶ء میں کلکتہ میں منعقد ہوا تھا جس میں ایک تجویز یہ بھی منظور ہوئی تھی کہ ... ملکہ معظمہ قیصرہ ہند کو جوبلی کا مبارک باد دیا جائے اور ... (رپورٹ تیسری نیشنل کانگریس دسمبر ۱۸۸۷ء منعقدہ ... ، لکھنؤ ...)

(۲) معلومات کے لئے دیکھئے تاریخ کانگریس ... پٹابھی سیتارامیہ ... ۱۹۱۰ء ... اردو ترجمہ ...

کی نہیں کوئی داد و فریاد نہیں ہے۔ ایسے وقت میں یہی ہوتا ہے کہ کمزور سے کمزور قومیں، بڑی سے بڑی طاقت کے خلاف اٹھ کھڑی ہوتی ہیں، بزبان حال دیتی ہیں اور کہہ دیتی ہیں کہ تنگ آمد بجنگ آمد، ایسے ہی حالات میں یہ فیصلہ بھی کیا جاتا ہے کہ

کنجشک فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو

بہر حال حضرت مولانا کے ان دونوں فتووں نے، برصغیر ہند کے مسلمانوں اور یہاں کی ملی تاریخ پر، گہرے اثرات محسوس کئے گئے۔ حضرت مولانا گنگوہی کے شاگردوں اور منتسبین کی ایک جماعت نے حضرت مولانا گنگوہی کی وفات کے عرصے کے بعد سیاسی امور و معاملات میں پہلے فتوے (آزاد حرب) کو اپنا رہنما بنایا، دوسری جماعت نے، دوسرے کو۔ یہ اختلاف رائے جو اس وقت پہلی مرتبہ سامنے آیا تھا، آج تک اسی طرح جاری ہے۔ اس میں کس نے کیا کھویا کیا پایا، یہ ایک طویل و پر پیچ بحث ہے۔ جی چاہتا ہے کہ اس کا مفصل تذکرہ ہو، مگر زیرنظر صفحات اس کا محل نہیں (۱)

حضرت مولانا گنگوہی کے قلم سے شرکت کانگریس کی مشروط اجازت: ہندوستان کی شرعی حیثیت کے حوالے سے، حضرت مولانا گنگوہی سے اس وقت تک صرف یہی تین فتوے معلوم ہیں جن کا تذکرہ ہوا۔ تاہم حضرت کی ایک تحریر یا فتوی اور ہے، جس میں اگرچہ ہندوستان کی شرعی حیثیت پر کوئی خاص گفتگو نہیں ہے، اتفاق و اختلاف کا کچھ تذکرہ نہیں، مگر ہندوستان کی سیاسی تحریکات کے تذکرہ میں، اس کا کثرت سے ذکر کیا جاتا ہے، یہ تذکرہ مسلمانوں نے بھی کیا ہے اور غیر مسلموں نے بھی، جس میں کانگریس کے بڑے قائدین اور برصغیر کے ممتاز سیاسی رہنما بھی شامل ہیں، اس لئے یہاں اس کو نظر انداز کرنا صحیح نہ ہوگا۔

کانگریس، جو بعد میں ایک بڑی اور جاندار سیاسی جماعت کے طور پر افق پر نمودار ہوئی اور اس وقت سے آج تک برصغیر کی سیاسی زندگی اور سرگرمی کے ہر دور، ہر پہلو پر اثر انداز رہی ہے، ایک سیاسی تنظیم کے طور پر قائم کی گئی تھی، جس کا مقصد، انگریز حکومت کو، ہندوستانیوں کے نظریات و خیالات سے آگاہ کرنا اور ان کی ضرورتوں اور مطالبات سے واقف رکھنا تھا۔ یہ تنظیم اس وقت بمبئی کے انگریز کمشنر ہیوم (HUME) (۲) نے قائم کی تھی، جس کے بنیادی مقاصد اور اصول میں یہ بات بھی شامل تھی، کہ ایسے مسائل بحث سے گریز کیا جائے، جو خلاف سرکار ہوں۔

اس تنظیم نے مقبولیت حاصل کی، اعلی تعلیم یافتہ ہندوستانیوں نے اس کا خیر مقدم کیا، مسلمان بھی اس میں شریک ہوئے، لیکن بعض مسلمانوں کو اس کی شرکت سے اختلاف بھی تھا، ان کے کچھ سوالات اور شبہات بھی تھے۔ اس وقت مولانا محمد لدھیانوی نے (جو کانگریس کے پرزور حامی اور بعد کے ایک نامور سیاسی قائد مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی کے دادا تھے)

---

(۱) سن ۱۸۵۷ء میں علمائے اسلام ... [illegible] ... کی مفصل تاریخ متعلقہ تمام پہلوؤں اور تفصیلات کے ساتھ ... [illegible] ... سے ۱۹۴۷ء تک ... [illegible] ... مسلم سیاست ... [illegible] ... ایک اچھی کتاب جس میں ... [illegible] ... (نور)

(۲) ALLAN OCTAVIAN HUME

کانگریس میں شرکت کے متعلق، ہندوستان کے چند بڑے علماء کی رائے دریافت کی جس میں حضرت مولانا گنگوہی بھی شامل تھے۔ اس کے سوال نامہ میں (جو محمد علی بھیم کے نام سے بھیجا گیا تھا) دو سوال تھے، کانگریس میں شرکت اور سرسید احمد کی تنظیم سے وابستگی کا شرعی حکم؟ حضرت مولانا گنگوہی نے دونوں کا حسب معمول ساتھ ہی جواب لکھا۔ کانگریس میں شرکت کے متعلق سوال اور اس کا جواب یہ ہے

"**سوال**: ایک جماعت قومی مسمی نیشنل کانگریس، جو ہندو اور مسلمان وغیرہ سکنائے ہند، واسطے رفع تکالیف وجلب منافع دنیاوی چند سال سے قائم ہوئی ہے، اور اس کا اصل اصول یہ ہے کہ بحث انہی امور میں ہو، جو کل جماعت ہائے ہند پر مؤثر ہوئی، اور ایسے امر کی بحث سے گریز کیا جاوے، جو کسی ملت یا مذہب کو منتہ ہو، یا خلاف سرکار ہو تو ایسی جماعت میں شریک ہونا، درست ہے، یا نہیں؟

جواب: اگر ہندو مسلمان باہم شرکت بیع وشرو تجارت میں کریویں، اس طرح میں کہ کوئی نقصان دین میں یا خلاف شرع معاملہ کرنا اور سود اور بیع فاسد کا قصہ پیش نہ آوے، جائز ہے اور مباح ہے۔"

اس کے بعد سرسید احمد کے متعلق، چند سطور تحریر ہیں [سرسید احمد اور ان کی تحریک کے متعلق سوال وجواب دونوں، اپنے موقع پر درج ہو چکے ہیں، اس لئے یہاں ان کے اعادہ کی ضرورت نہیں] پھر لکھا ہے

"ہنود سے شرکت معاملہ کر لینا، اور اگر ہنود کی شرکت سے ور معاملہ سے بھی، کوئی خلاف شرع امر لازم آتا ہو، یا مسلمانوں کی ذلت یا اہانت یا ترقی ہنود ہوتی ہو، وہ کام بھی حرام ہے، جیسا کہ اوپر لکھا گیا، اسی طرح پر ہے اور بس۔ فقط۔

بندہ رشید احمد گنگوہی عفی عنہ"(۱)

بہرحال یہ بھی اس سلسلہ کا ایک ضمنی فتوی یا تحریر ہے، جس سے ہندوستان کے مذاہب اور قوموں کے فراد میں، مشترکہ مفادات کے معاملات میں، حضرت مولانا گنگوہی کی رائے ایک درجہ میں، سامنے آجاتی ہے۔ یہی اس فتوے یا تحریر کے یہاں پیش کرنے کا مقصد ہے۔

نسخہ کی تدوین میں راقم سطور کی خدمت: جیسا کہ ذکر ہو، حضرت مولانا گنگوہیؒ کے فتوائے دار الحرب کے، اس وقت تک صرف تین نسخے معلوم ہیں۔ جس میں دو جو نسبۃً متاخر ہیں، شائع ہو چکے ہیں، جو نسخہ قدیم ترین معلوم ہے، وہ اب تک شائع نہیں ہوا تھا، آئندہ صفحات میں پیش کیا جا رہا ہے۔

( ) نصرت الابرار ۔ مرتبہ مولانا محمد عبد الحی لودی ۔۔۔۔۔۔ ص (لاہور ۱۳۰۹ھ)
فتاوی قادریہ ۔ مرتبہ مولانا محمد عبد الحی لودی ص ۲۸ ۔ ۳۲ (لاہور ۱۳۰۹ھ)
نصرت الابرار اور فتاوی قادریہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس موضوع پر حضرت گنگوہی کا ایک مفصل فتوی اور بھی تھا، جو مولانا عبد الحی لودی نے نصرت میں موجود تھا مگر دونوں میں کہیں نقل ہوا اور نہ اب تک اس کا سراغ ملا۔

(۸۶۵)

ہندوستان دار الحرب ہے، یا دار الاسلام؟

سوال و مکتوب مولانا سعید الدین صاحب رام پوری

بنام محدث عصر، فقیہ جلیل حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ

اے پیش از آں کہ در قلم آید ثنائے تو ☆ واجب بر اہل مشرق و مغرب دعائے تو
اے در بقائے ذات تو، نفع جہانیاں ☆ باقی مباد ہر کہ نخواہد بقائے تو

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ! الحمد للہ تا حال بعافیت ہستم و عافیت سامی، از دل و جان خواہاں می باشم۔

بعض اعلام بفتوی بہ بودن ہندوستان دار الحرب، بدلائل مسائل و روایات فقہیہ مرقومۃ ذیل، دادہ اند۔ چوں ایں روایات بنظر احقر گذشتند و احقر ازاں یوم، کہ برائے تحصیل شرف قدم بوسی بخدمت حاضر شدہ بودم، از زبان مبارک سامی شنیدہ بودم، کہ ایں بلاد مطابق رائے بندہ دار الحرب ہستند۔ آں وقت بسبب ضعف سامی، جرأت استفسار روبرو یافتہ وجہ حکم و دلائل فقہیہ نکردم۔

لہٰذا حالا عرض می دارم، کہ اگر باقدرے تفصیل روایات فقہیہ، کہ از آں بودن ہندوستان دار الحرب مستنبط می شود تحریر فرمایند، و از طریق استنباط نیز اطلاع بخشند، از اخلاق نبویہ سامی بعید نخواہد بود۔ ایں روایات ایں است۔ خزانۃ المفتین میں ہے:

دار الإسلام لا تصير دار الحرب إلا بإجراء أحكام الشرك فيها، وأن يكون متصلاً بدار الحرب، لا يكون بينها وبين دار الحرب مصرٌ آخر للمسلمين، وأن لا يبقى فيها مسلم وذمي آمناً بالأمان الأول، فما لم توجد هذه الشرائط، لا تصير دار الحرب.

ومعنى قوله: أن لا يبقى فيها مسلم أو ذمي آمناً بالأمان الأول، أن لا يبقى فيها مسلم أو ذمي آمنا على نفسه إلا بأمان المشركين.

وفي الأصل: إذا أجروا فيها أحكام الشرك فإنها تصير دار الحرب، سواء كانت متصلة بدار الحرب أو لم تكن، بقي فيها مسلم أو ذمي آمناً بالأمان الأول أو لم يبق.

toobaa-elibrary.blogspot.com

ودار الحرب تصير دار لاسلام بجراء احكم الاسلام فيها، وإن زال عبة اهل الاسلام كذا فى شرح لسير.. .لأبى اليسر.

ان دار الاسلام لاتصير دار الحرب، مالم يبطل حميع ماصارت به دار الاسلام، لأن الحكم ،داثبت بعلة، فما بقى من العلة شئ يبقى بقائه.

وفى المنثور دار الاسلام باجراء احكام الاسلام، فما بقى عقلة من علائق الاسلام، يترجح جانب الاسلام وفى البزازية قال السيد الامام - والبلاد التى فى ايدى الكفرة اليوم، لاشك انها بلاد الاسلام، بعد ان لم يظهر فيها احكام الكفرة بل القضاة مسلمون

وأمّا البلاد الّتي عليها والٍ من جهتهم، فيجوز به إقامة الجمعة والأعياد.وأخذ الخراج، و تقليد القضاة،وترويج الأيامى وأمّا البلاد الّتي عليها ولاة كفار، فيجوز فيها أيضاً إقامة الجمعة والأعياد، والقاضي قاضٍ بتراضي المسلمين.

وقد تقرّر أن بقاء الشيْ من العلة يبقى الحكم، وقد حكم بأنّ هذه الدار قبل استيلاء التتار كانت من ديار الإسلام، وبعد استيلائهم إعلان الجمع والجماعات، والحكم بمقتضى الشرع، والفتوى والتدريس شائع بلانكير من ملوكهم، فالحكم بأنها من دار الحرب لاجهة له، اى دراية ورواية.

وإعلان بيع الخمور وأخذ الضرائب والمكوس، والحكم من رسم التتار (هو) كإعلان بنى قريظة بطلب الطاغوت، ومع ذلك كانت بلدة إسلام بلاريب.

وذكر انه إنما يصير دار الحرب بإجراء أحكام الكفر، وأن لايحكم فيها بحكم من الإسلام، وأن يتصل بدار الكفر وأن لايبقى فيها مسلم اوذمى اما بالأمان الأول، فإذا وجدت الشرائط كلها صارت دار الحرب. وعند تعارض الدلائل والشرائط يبقى ما كان، اويترجح جانب الإسلام احتياطاً

وفى شرح الزيادات للعتابى دار الاسلام إنّما يصير دار الحرب بثلاث شرائط، أحدها إجراء أحكام الكفار على سبيل الاشتهار.

والثانى: أن تكون متاخمة اى متصلة بدار الحرب، لايتخلّل بينهما بلدة من بلاد الإسلام.

والثالث أن لایبقی فیها مسلم أو ذمی آمنا بالأمان الأول، فشرط هذه الشرائط لیکون

عدما تاما علی تمام القهر والاستیلاء، إذ دار الاسلام یحتاط لارتباطه له، وعدمها یصیر

دار الاسلام دار الحرب، باجراء أحکام الکفر فیها

ودر طحطاوی حاشیہ در مختار اینکہ

قوله باجراء احکام الشرک أی علی الاشتهار، وأن لایحکم فیها بحکم اهل الإسلام.

(وفی) الهندیة وظاهره لو اجریت أحکام المسلمین وحکم اهل الشرک لایکون

دار حرب انتهیٰ

پس ایں بلاد نہ بمذہب امام صاحب ونہ بمذہب صاحبین رحمہم اللہ دار الحرب تو نشد، چہ موقوف و معطل شدن،

احکام اسلام بالکلیہ شرط متفق علیہ معدوم میشود، وفقدان ایں شرط ظاہر چہ بسیارے از احکام اسلام تا ہنوز باقی و جاری اند۔

واگر ایں بلاد مطابق رائے حضور دار الحرب باشند، پس دریں بلاد حکم گرفتن سود و رہن از کفار چہ باشد، و نیز از منشأ

و ماخذ ایں روایت کہ از کتاب و سنت باشد، اطلاع ئے زیب رقم فرمایند۔

در صورت دار الحرب دار الاسلام، اگر جریان بعض احکام اسلام کافی تواند بود، پس ظاہر تمامی روئے زمین دریں زمان

دار الاسلام خواہد بود۔ والسلام خیر ختام ہے۔ فقط

۱۷ر شعبان ۱۳۱۰ھ [۷/ مارچ ۱۸۹۳ء]

سعد آباد ضلع متھرا

toobaa-elibrary.blogspot.com

جواب استفتاء مولانا سعید الدین رام پوری

از حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ

از بندہ رشید احمد گنگوہی عفا عنہ

عنایت فرمائے بندہ، مولوی سعید الدین صاحب، دام اشفاقہم

بعد سلام مسنون الاسلام، مطالعہ فرمایند، خط ایشاں بماہ رمضان در باب تحقیق مسئلہ دار الحرب رسید، از آنجا کہ طبع خود مضمحل از مدت شدہ، و در رمضان زیادت براں شد، تحریر جواب قاصر ماند، اکنوں آنچہ می تواند می نگارم۔

باید شنید کہ مدار بودن حکم بلدے و ملکے بدار الاسلام و بدار الحرب، بر غلبہ مسلمانان و غلبہ کفار است و بس، لہٰذا ہر موضع کہ مقہور حکم مسلمین است، آں را دار الاسلام گفتہ خواہد شد، و ہر محلے کہ مغلوب حکم کفار است، دار الحرب نامیدہ خواہد شد۔ قال فی جامع الرموز:

دار الاسلام ما يجري فيه حكم امام المسلمين، وكانوا فيه آمنين **ودار الحرب** ما خافوا فيه من الكافرين، انتهى.

وقال في رد المحتار:

سئل قارئ الهداية عن البحر الملح، أمن دار الحرب أو الاسلام؟ أجاب انه ليس من احد القبيلتين، لأنه لا قهر لأحد عليه انتهى.(۱)

غرض از نقل ایں عبارت آنست، کہ مدار بودن دار کفر و اسلام، بر غلبہ کفر و اسلام است و بس، اگرچہ در بحر ملح راہ قوت ... بدار حرب بودن باشد بوجہے دیگر، و ہر مقامیکہ مقہور ہر دو فریق باشد، آں را بحکم **الاسلام یعلو ولا یعلی** ہم دار الاسلام خواہند گفت، مگر بہ ہمیں شرط کہ غلبہ و قہر بعض وجوہ اہل اسلام در آنجا باشد، نہ آنکہ نفس مقام مسلمین در آنجا بود، یا ظہور بعض شعائر اسلام باذن کفار در آنجا بودہ باشد، کہ نفس کون اہل اسلام در دارے، و اظہار شعائر اسلام باذن کفار در بلدے، قابل اعتبار نیست۔ و علی ہذا بودن کفار در دار اسلام و اظہار شعائر کفر باذن حکام اسلام، یا اطاعت ایشاں در آنجا دار الاسلام بودن را ضرر نمی کند، چہ در ہر دو شق غلبہ یافتہ نمی شود، و حکم غلبہ را است، نہ نفس وجود و ظہور را۔

(۱) شامی ج ۳ ص ۲۴۷، باب استیلاء الکفار (مطبع کمال مطابع، دہلی ۱۲۸۹ھ) ب مطابق نسخہ ع ک

toobaa-elibrary.blogspot.com

از یست کہ اہل ذمہ در دار الاسلام، قیام باذن اسلام می کنند، وشعائر خود ظاہری نمی نمایند، مگر دار الاسلامیت بحال خود می ماند،
مسلمین در دار کفر بامن می روند، وشعائر خود را تنہا ظاہری کنند۔ وایں ہمہ دار کفریت را رفع نمی کند۔

نہ بینی کہ آنحضرت علیہ الصلوٰۃ والسلام بجمع کثیر در عمرۃ القضاء بمکہ شریف بردند، و جماعت نماز وغیرہ شعار اسلام وغیرہ ہمہ با علان بجا آوردند، وایں قدر تمتع داشتن کہ کفار را مقہور فرمایند، چنانچہ بہمیں قدر لشکر در حدیبیہ عزم تاراج کردن، مکہ می فرمودند۔ مگر چوں ایں ہمہ اظہار باذن کفار بود، در آں ایام مکہ دار الاسلام نگشت، بلکہ دار الحرب ماند۔ چرا کہ ایں قیام واظہار اسلام باذن بود نہ بغلبہ۔

الحاصل ایں اصل کلی قاعدہ کلیہ ہست، کہ دار الحرب مقہور کفار ست ودار الاسلام مقہور اہل اسلام۔ اگر چہ در یک دار فریق دیگر ہم موجود باشند، بلا غلبہ وقہر، و آنجا کہ قہر ہر دو فریق باشد وہم دار الاسلام خواہد بود۔ [ص ۲] ایں اصل را خوب ذہن نشین باید کرد، کہ جملہ مسائل از ہمیں اصل می بر آیند وہمہ جزئیات ایں باب، بر ہمیں اصل دائر ہستند۔

بعد ازیں امرے دیگر باید شنید، کہ ہر موضع کہ دار کفر باشد واہل اسلام براں غلبہ کردند، وحکم اسلام در آں جاری کردند، آں را جملہ علماء می فرمایند، کہ دار الاسلام گشت۔ چرا کہ غلبہ وقہر مسلمانان یافتہ شد، اگر چہ بعض وجوہ غلبہ کفار ہم در آنجا باقی باشد، مگر تاہم بحکم **الاسلام یعلو ولا یعلی** باتفاق دار الاسلام شد **کما وضح سابقًا**

مگر باز وضع کردہ می شود، کہ اگر ایں دخول وظہور اسلام بغلبہ شدہ باشد ہیچ تغیر در دار حربیت نخواہد شد، ورنہ جرمن وروس وفرانس جملہ ممالک نصاریٰ، وچین وغیرہ ممالک کفار دار الاسلام می شوند ونشانے از دار الحرب در دنیا پیدا نخواہد شد، زیرا کہ در جملہ ممالک کفار اہل اسلام باذن کفار احکام اسلام جاری می نمایند **وھذا ظاہر البطلان**۔

بہر حال جرائے ایں احکام بغلبہ وقہر معتبر است ونہ بس۔ وہر مقامے کہ دار الاسلام بود کفار براں غلبہ کردند، اگر غلبہ اسلام بالکل رفع شد آں را حکم دار الحرب شد، واگر غلبہ کفار شد وبعضے وجوہ غلبہ اہل اسلام ہم باقی ماندہ باشد، آں را دار الاسلام خواہند گفت، نہ دار الحرب، وریں مسئلہ اتفاق است۔

اما اینکہ غلبہ اہل اسلام بالکلیہ رفع شدن را چہ حد است، دراں خلاف واقع شدہ در میان ائمہ ما علیہم الرحمۃ۔

صاحبین می فرمایند، کہ اگر ہر دو فریق احکام خود را جاری بالاعلان کردہ باشند، غلبہ اسلام ہم باقیست، ورنہ در صورت علان احکام کفار، وعدم قدرت اہل اسلام بر جرائے احکام خود بغیر خوف الا باذن، لکنہ غلبہ اسلام ہیچ قدر باقی نمی ماند، **وھو القیاس** چرا کہ ہرگاہ کفار چناں مسلط شدند کہ احکام کفر علی الاعلان والغلبہ جاری کردند، واہل اسلام آں قدر عاجز ومغلوب گشتند، کہ احکام خود جاری کردن نمی توانند، واز حکم کفر کہ شکستن وجدار اسلام است، قدرت ندارند، پس کدام درجہ غلبہ اسلام باقی ماند، کہ آں را دار الاسلام گفتہ شود، بلکہ تسلط وغلبہ کفار را بکمال پیدا شد، ودار الحرب گشت بالفعل۔ وبعد ازاں ہرچہ خواہد شد، خواہد شد، مگر الحال دار الحرب شدن، ہیچ مانع ندارد، وشکل دار الحرب قائم مقصود کفار شد **کما ھو الظاہر**۔

toobaa-elibrary.blogspot.com

وامام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ بنظر دقیق استحسان فرمودہ، و دار اسلام را بحکم دار کفر دادن احتیاط کردہ، کہ تا چیزے از آثار غلبۂ اسلام یافتہ شود، ویا در استیلاء کفار وھنے یافتہ شود، کہ [ص ۳] دفع آن بر مسلمانان سخت دشوار نیاید، حکم بدار کفر نباید کرد۔

پس دو شرط دیگر زائد فرمود یکے آں کہ آں دیار بعد مستولی علیہ کفار، متصل بدار کفر گردد، چنانچہ در میان ایں قریہ مستولی و دار حرب، موضع از دار اسلام حائل نماند، کہ بدیں اتصال انقطاع از دارالاسلام باب پیدا می شود کہ باحراز کفار ودار یہ و غلبہ و قہر کفار بقوت شد، و استخلاص آں از دست کفرہ دشوار گردید، و مقہوریت مسلمین مکان آنجا بکمال رسید، و ایں بمشابہ آنست کہ کفار بر مال اہل اسلام مستولی شدند، اگر باحراز دار شاں رسید بملک ایشاں در آید، و اگر احراز ایشاں بدار خود نشدہ، انقطاع ملک، ملک مسلم نمی شود۔ کما ھو مقرر فی سائر الکتب

قال فی الھدایۃ. واذا غلبوا علی اموالنا واحرزوھا بدارھم ملکوھا الخ (۱)

وقال فیہ غیر أن الاستیلاء لا یتحقق إلا بالاحراز بالدار، لانہ عبارۃ عن الاقتدار علی المحل حالا ومآلا.... الخ

پس ہم چنیں اراضی و عقار بعدے مثلا مستولی کفار شد، اگر استیلاء تمام گشت کہ محرز بلد کفر گشت، و آں احراز باتصال او وست بدار کفر، و انقطاع او از دار الاسلام، پس مقہوریدی کفرہ گشت، و رنہ ہنوز استیلاء اہل اسلام باقیست، اگرچہ ضعیف باشد، پس بحکم الاسلام یعلو ولا یعلی دار اسلام باید کہ بماند۔ پس حاصل ایں شرط ہم ہموں غالبیت کفار و مغلوبیت اہل اسلام است، کہ اصل کلی اولا بیان شد۔

شرط دوم آنکہ امانے کہ حاکم اسلام بسبب غلبہ حکومت خود مسلماناں را بسبب اسلام، و کفار رعایا را بوجہ عقد ذمہ دادہ بود، مرتفع گردد، کہ بآں امان کسے بر نفس و مال خود مامون نماند۔ یعنی چنانکہ بسبب امن دادن حاکم اسلام، ہمیشہ مامون شدہ بودند، کہ کسے را بسبب خوف حاکم، امن دہندہ محل نبود، کہ تعرض بجان و مال مسلم و ذمی نمایند، و ایں نبود مگر بسبب قوت و شوکت و غلبہ حاکم مسلم، پس ایں امان باقی نماند، کہ کسے بعد ایں امن بے خدشہ از تعرض جان و مال خود نبود، بلکہ ایں امان بیکار محض گردد۔

وامانے کہ مشرکین مستولی دادند، آں موجب امن گردد، پس ظاہر است کہ تا بسبب امن حاکم مسلم، خوف موذی را خواہد بود، غلبہ و شوکت امن مسلم بنوعے باقی ماندہ باشد، و ہرگاہ آں چیزے نماند، بلکہ ایں مشرک متسلط محل نظر [ص ۴] گردید، امان او مرتفع شد۔ پس نزد امام علیہ الرحمۃ ہرگاہ کہ بعد اجرائے احکام کفر علی الاشتہار، ایں دو شرط ہم یافتہ شد، غلبہ کفر من کل الوجوہ ثابت شد، و غلبۂ اسلام من کل الوجوہ مرتفع گردید اکنوں ہیچ از حریت ناچار حکم کردہ خواہد شد۔

(۱) ہدایہ ص ۵۸۱ ج ۲ باب استیلاء الکفار (مکتبہ تھانوی دیوبند ۱۴۱۲ھ) (ت) مطابق (ن۔گ)

پس دشمن را از زمین ہم معلوم میشود، کہ مدار این قوت ہم بر قہر و غلبہ است و پس کہ مدار در اصل کلی است مقرر کردہ شد.

بعد ازین تحریر روایت فقہیہ در بید شنیدہ نقل بعضی آنہا سند تقریر این بندہ حاصل خواہد شد، دیدہ تر بعض حال کل روایت این باب دریافت خواہد شد. قال فی العالمگیریة

قال محمد فی الزیادات انما تصیر دار الاسلام دار الحرب عند ابی حنیفة بشرائط ثلاث احدها اجراء احکام الکفر علی سبیل الاشتهار، وان لا یحکم فیها بحکم الاسلام، الثانی ان تکون متصلة بدار الحرب، لا یتخلل بینهما بلدة من بلاد الاسلام الثالث ان لا یبقی مومن ولا ذمی آمنا بالامان الاول، بامانه الذی کان ثابتا قبل استیلاء الکفر، للمسلم باسلامه، وللذمی بعقد الذمة وصورة المسئلة علی ثلاثة اوجه اما ان یغلب اهل الحرب علی دار من دورنا، او ارتد اهل مصر وغلبوا واجروا احکام الکفر، او نقض اهل الذمة العهد، وتغلبوا علی دارهم، ففی کل من هذه الصور لا تصیر دار الحرب الا بثلاث شرائط وقال ابو یوسف ومحمد رحمهما الله تعالی بشرط واحد لا غیر وهو اظهار احکام الکفر وهو القیاس انتهی (۱)

قال فی جامع الرموز. واما صیرورتها دار الحرب، فعنده بشروط، احدها اجراء احکام الکفر اشتهارا، بان یحکم الحاکم ولا یرجعون الی قضاة المسلمین کما فی الحر والثانی. الاتصال بدار الحرب، بحیث لا یکون بینهم بلدة من بلاد الاسلام، ما یلحقهم العدو منها......الخ

ازین روایت جامع الرموز دو امر واضح شد

یکے آنکہ مراد از اجراء حکم اہل اسلام واظہار حکم اسلام است علی سبیل الغلبة نہ مطلق ادائے جماعت وجمعہ مثلا، چرا کہ در روایت بان یحکم بحکمهم ولا یرجعون الی قضاة المسلمین یعنی قضاة مسلمین را ہیچ شوکت ووقعت نماند کہ بایشان رجوع نشود، ہمچنان از حکم مسلمین در دار حرب، حکم بغلبہ کردن مراد است. کماهو الظاهر بہرحال حکم اسلام وحکم کفر ہم علی سبیل القوة والغلبة مراد است، نہ محض اظہار.

دوم اینکہ غرض از شرط اتصال وانقطاع ہمون قوت است، کہ در صورت اتصال بدار الحرب، مدد بقریہ مغلوب نمی رسد، بخلاف صورت انقطاع از دار الحرب کہ لحوق مدد می تواند، پس ہنوز قوت اسلام باقی است.

---

(۱) عالمگیریہ ج ۲ ص ۲۳۲ مطلب فیما یصیر دار الاسلام دار الحرب، مطبوعہ ... پشاور ... ص ۲۵۳، ج ۲،
(۲) جامع الرموز ص ۲۹۸

toobaa-elibrary.blogspot.com

وفی جوامع المفتین [ص] دار الاسلام لاتصیر دار الحرب، الا باجراء احکام الشرک فیها، وان یکون متصلا بدار الحرب لایکون بینها وبین دار الحرب مصر آخر للمسلمین، وان لایبقی فیها مسلم أو ذمی آمن بالامان الاول فمالم توجد هذه الشرائط لاتصیر دار الحرب

ومعنی قولنا ان لایبقی فیها مسلم أو ذمی آمن بالأمان الاول ان لایبقی فیه مسلم وذمی اما علی نفسه الا بامان المشرکین ... الخ

وفی البزازیة قال السید الامام والبلاد التی فی ایدی الکفرة الیوم، لاشک انها بلاد الاسلام بعد، لانه لم یظهر فیها حکام الکفرة بل القضاة مسلمون، انتهی

پس بدیدیہ کہ ایک بیان ... دار الاسلام ... بل القضاۃ مسلمون ... احکام اسلام بطور اول باقیست، ونیز ... بلاد الناس یصلون ویجمعون، ... احکام بطور شوکت ... مراسم دین خود ... حاکم غالب۔

در ... (۱) وغیرہ

فی معراج الدرایة عن المبسوط والبلاد الاسلام التی فی ایدی الکفرة بلاد الاسلام لابلاد الحرب، لانهم لم یظهروا فیها حکم الکفر والقضاة مسلمون، والملوک الذین یطیعونهم فهاق عن ضرورة مسلمون ولو کانت عن غیر ضرورة منهم أو بدونها وکل مصر فیه وال من جهتهم، تجوز فیه اقامة الجمعة والاعیاد واخذ الخراج وتقلید القضاة وتزویج الایامی لاستیلاء المسلم علیه، واما بلاد علیها ولاة کفار فیجوز للمسلمین اقامة الجمعة والاعیاد ویصیر القاضی قاضیا بتراضی المسلمین فیجب علیهم ان یلتمسوا والیا مسلما انتهی

وفیه ایضا. قلت، وبهذا اظهر ان مافی الشام من جبل تیم الله وبعض البلاد التابعة له کلها بلاد الاسلام، لانها وان کانت لها حکام دروز اونصاری ولهم قضاة علی دینهم، وبعضهم یعلنون بشتم الاسلام، لکنهم تحت حکم ولاة امورنا، وبلاد اسلام محیطة ببلادهم من کل جانب، واذا اراد ولی الامر تنفیذ احکامنا فیهم، نفذها انتهی

(۱) شامی ... کتاب القضاء ... (... ۳۶۵ ... ۳۶۹ ... ۳۹۱ ...)

ازیں ہر دو روایت واضح شد کہ برائے بقاء دار سلامیت، بعد غلبہ کفار، بقاء قوت و شوکت حکام مسلمین و نفاذ امر بقوت و غلبہ مرادی شود، کہ چناں در دار حرب اجراء حکم اسلام، اگر بقوت باشد، دفع دار حربیت می شود، نہ ادائے محض شعائر اسلام بہ اذن و رغبت حکام مخالف دین۔

حاصل غرض ازیں شروط ثلاثہ نزد امام صاحب و از شرط واحد کہ اجراء حکم اسلام است نزد صاحبین ہموں وجود غلبہ و قوت اہل اسلام است، اگرچہ بعض وجوہ باشد، و ہیچ اہل فقہ (ص ۸) نمی گوید کہ در ملک کفار، اگر کسے باذن ایشاں صراحۃ یا دلالۃ اظہار شعائر سلام کند آں ملک دار اسلام می شود، حاشا وکلا کہ ایں دور از فقہ است۔

چوں ایں مسئلہ منقح شد، اکنوں حال ہندرا غور فرمایند کہ اجرائے احکام کفار نصاری دریں جا بچہ قوت و غلبہ است کہ اگر ادنی کلکٹر ہم حکم بدہد کہ در مساجد نماز جماعت نواہند، ہیچ کس از امیر و غریب قدرت ندارد، کہ ادائے آں نماید۔ و ایں ادائے جمعہ و عیدین و حکم بقواعد فقہ کہ می شود، محض بوجہ قانون ایشاں است، کہ در رعایا حکم جاری کردہ اند، کہ ہر کس حسب دین خود عمل نماید، و سرکار را اعتراض بر آں نیست۔ و ایں سلاطین اسلام کہ بود، از آں تا مے و نشانے نماندہ، کدام عاقل قائل خواہد شد، کہ معنے کہ شدہ عائد و موجود بود، اکنوں ہموں امن، ما موں نشستہ ایم، بلکہ امن جدید از کفار شدہ و بہ ہموں امن نصاری جمعہ عاید، قیام ہندی کنند۔

و اما قصاص پس آں در ملک واقامتہ دیانت جملہ ورقہ بعد ایں شرح کردہ اند، کہ مدد سیدین از آں حکومت مراد است۔

و نیز می تواں گفت کہ اگر عدد کامل باشد و مدد آید، کفار را از ہند خارج کند، حاشا وکلا، بلکہ اخراج ایشاں بسیار اصعب است و مستقل جہاد و جنگ ساماں کثیر می خواہد۔

بہر حال تسلط کفار بر ہند بداں درجہ ہست، کہ در ہیچ وقت کفار را بر ہند حرب زیادہ ازیں نہ بود۔ و ادامر ہم اسلام بر مسلماناں محض باجازت ایشاں است، و از مسلماناں عاجز ترین کسے از رعایا نیست کہ ہنود را ہم قدرے رسوخ است مگر مسلماناں را چیزے وقعت نیست۔ اما در ملک رامپور و بھوپال کہ حکام آنجا، باوجود مغلوب بودن کفار، احکام خود جاری دارند، دار اسلام تواں گفت، چنانچہ از روایات ردالمحتار وغیرہ مستفاد می شود فقط

اکنوں بعد سلام مسنون آنکہ اگر ازیں تحریر طمانیت شما حاصل شود، بہو مراد، ورنہ بندہ را معذور دارند، مگر چونکہ از تحریر طویل عاجز ہستم ایں مسودہ را روانہ می کنم، امید کہ بعد نقش داشتہ ایں بمصوب فرمایند، کہ بعض مردم ایں جا ہم قصد نقش می دارند۔

فقط والسلام

(۱۰ شوال ۱۳۰ ھ ۲۲ ر اپریل ۱۸۹۳ء)

آج ۱۶ ذی قعدہ ۱۴۲۶ھ روز پنجشنبہ تینوں نسخوں سے مقابلہ و اختلاف نسخ کی تحریر و ترتیب مکمل ہوئی

فالحمد للہ علی ذالک

نور الحسن راشد کاندھلوی

toobaa-elibrary.blogspot.com

ہندوستان دارالحرب ہے یا دارالاسلام؟

ترجمہ مکتوب واستفتاء

مولانا سعید الدین رام پوری (رام پور ضلع سہارنپور)

بنام محدث عصر، فقیہ جلیل حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ

اے اس سے بڑھ کر کہ قلم پر تیری تعریف آسکے ۔ اہل مشرق ومغرب پر تیرے لئے دعا واجب ہے

اے وہ کہ جس کے باقی رہنے میں پوری دنیا کا فائدہ ہے ۔ ہر وہ شخص باقی رہے جو تیری بقا کا متمنی ہے

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، ابھی تک خیریت سے ہوں، اور جناب عالی کی خیر وعافیت کا دل وجان سے طلبگار رہتا ہوں۔

بعض بڑے علماء نے مسائل اور روایات فقہیہ کی مدد سے، جو نیچے نقل کر رہا ہوں، ہندوستان کے دارالحرب ہونے کا فتویٰ دیا ہے۔ چونکہ یہ روایتیں احقر کی نظر سے گزری ہیں اور ان دنوں، جب یہ حقیر قدم بوسی کی سعادت حاصل کرنے کے لئے، خدمت اقدس میں حاضر ہوا تھا، میں نے زبان مبارک سے سنا تھا، کہ یہ بلاد اشہر وعلاقے، ہندو کی رائے کے مطابق، دارالحرب ہیں۔ اس وقت جناب عالی کے ضعف کو دیکھتے ہوئے سوال کرنے کی ہمت نہ کی، اور اس رائے کی وجہ اور اس سے متعلق فقہی روایات معلوم نہیں ہیں۔

اس لئے اب گذارش کرتا ہوں، کہ ان روایت فقہیہ کی کسی قدر تفصیل کہ جن سے ہندوستان کا دارالحرب ہونا معلوم ہوتا ہو، تحریر فرمائیں، اور ان روایتوں سے استدلال کے طریقہ کی بھی وضاحت بخشیں۔ اخلاق عالی سے جو اخلاق نبوی کا گویا ایک نمونہ ہیں، یہ غیر متوقع نہ ہوگا۔

اور وہ روایات یہ ہیں

خزانۃ المفتین میں ہے: دارالاسلام دارالحرب نہیں ہوتا، مگر اس میں شرک کے احکام جاری ہونے سے، یا یہ ہو کہ وہ شہر دارالحرب سے اس طرح مل جائے، کہ اس شہر اور دارالحرب کے بیچ میں مسلمانوں کا کوئی شہر باقی نہ ہو،

اور اس علاقہ میں کوئی مسلمان یا ذمی، پہلے معاہدہ کے مطابق، محفوظ و مامون نہ رہے۔ پس جب تک یہ شرطیں نہ پائی جائیں گی تو یہ شہر دارالحرب نہ ہوگا۔

اور ہمارے اس قول کا کہ اس میں کوئی مسلمان یا ذمی پہلے معاہدہ اور دستاویز امن کے مطابق، امن سے اور محفوظ نہ رہے، مطلب یہ ہے کہ اس کو اپنی ذات کی حفاظت کا یقین نہ ہو مگر مشرکین کی امان سے۔

اور [صاحبین نے] کہا ہے کہ جب دار الاسلام میں شرک کے احکام جاری ہو جائیں۔ تو وہ دار الحرب ہو جاتا ہے، چاہے وہ دار الحرب سے ملا ہوا ہو یا نہ ہو، اس میں مسلمان اور ذمی پہلے امن اور امان کے معاہدہ کے مطابق ہوں یا نہ ہوں۔ اور دار الحرب دار الاسلام ہو جاتا ہے، اس میں اسلام کے احکامات جاری ہونے کے ذریعہ سے۔ اگرچہ پہلے وہاں سے اسلام کی شوکت ختم ہو گئی ہو۔ یہی شرح سیر کبیر میں لکھا ہے۔

بلا شبہ دار الاسلام دار الحرب نہیں ہوتا، جب تک اس میں موجود وہ سب باتیں، جن کی وجہ سے دار الاسلام ہوا تھا، ختم نہ ہو جائیں۔ کیونکہ حکم جب کسی علت کی وجہ سے ثابت ہو تو جب تک یہ وجہ باقی ہے تو یہ حکم بھی باقی رہے گا۔

اور منشور میں ہے کہ دار الاسلام احکام اسلام جاری ہونے سے ہوتا ہے، جب تک اس میں اسلام کی علامتوں میں کوئی علامت باقی رہے گی، اس کی اسلام کی جانب نسبت کو ترجیح رہے گی۔

اور بزازیہ میں ہے سید امام نے کہا کہ وہ شہر جو آج کل کافروں کے قبضے میں ہیں، اس میں کچھ شک نہیں کہ وہ بلاد اسلام ہیں، کیونکہ ان میں اہل کفر کے احکامات جاری نہیں، بلکہ مسلمان قاضی مقرر ہیں۔ اور وہ شہر جن پر غیر مسلم حکام کے نمائندے، بڑے فریق کی حیثیت سے متعین ہیں، تو ان میں بھی جمعہ کی نماز قائم کرنا، عید کی نماز پڑھنا، ٹیکس لینا، قاضیوں کی پیروی کرنا، بیواؤں کے نکاح کرنا درست ہے، اور وہ علاقے جس میں کافر حکام مسلط ہوں تو ان میں بھی جمعہ قائم کرنا اور عیدین کی نماز پڑھنا جائز ہے۔ اور مسلمانوں کی باہمی رضامندی سے قاضی مقرر کر لینے سے، قاضی ہو جاتا ہے۔

اور یہ واضح ہو گیا، کہ اگر کسی چیز کے حکم کی کوئی علت باقی ہو تو وہ حکم بھی باقی رہے گا، اور [ہمارے علماء نے] یہ بھی فیصلہ کیا ہے، کہ یہ علاقے تاتاریوں کے قبضے سے پہلے دیار اسلام میں سے تھے، اور ان کے قبضہ کے بعد بھی جمعہ، جماعت کی نماز اور شریعت کے تقاضے، فیصلے کے متعلق فتوے، کتابوں کی تعلیم ان کے کسی سربراہ کے کسی اعتراض کے بغیر چالو رہی۔ پس ان کے یہ فیصلے کرنا کہ وہ دار الحرب ہیں، اس کی کوئی بنیاد نہیں ہے، نہ درست دلیل۔

toobaa-elibrary.blogspot.com

اور نشہ والی چیزوں کی برملا خرید و فروخت، اور پیہ چنگی اور ٹیکس وصول کرنا اور تاتاریوں کی قومی رسموں کے مطابق احکامات جاری ہونا ایسا ہی ہے جیسے کہ بنی قریظہ کا حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی سورتی (رکھنے) کی اجازت مانگنا حالانکہ وہ (مدینہ منورہ) اس کے باوجود بھی بلاشک وشبہ دارالاسلام تھا۔

اور کہا گیا ہے کہ (علاقے اور شہر) کفر کے احکامات جاری ہونے کی وجہ سے دارالحرب ہو جاتے ہیں جب کہ ان (شہروں) میں اسلام کے احکامات کے مطابق، کوئی حکم جاری نہ ہو، اور یہ کہ اس میں کوئی مسلمان اور ذمی مسلمانوں کے پہلے معاہدہ (اور امان) کے مطابق محفوظ نہ رہے۔ لہٰذا جب بھی یہ شرطیں پائی جائیں گی، تو وہ سب دارالحرب ہو جائے گا، لیکن اگر ثبوت اور شرائط میں اختلاف ہو تو وہ دارالاسلام، اسی حکم (دارالاسلام ہونے) پر باقی رہے گا، یا اسلام کے پہلو کو احتیاطاً ترجیح دی جائے گی۔

اور عتابی کی شرح زیادات میں ہے دارالاسلام دارالحرب ہو جاتا ہے، تین شرطوں (کے پائے جانے) سے

[اول] اس میں کافروں کے احکامات علی الاعلان جاری ہو جائیں۔

دوم یہ ہے کہ یہ علاقہ دارالحرب سے ملا ہوا ہو، اور اس شہر اور دارالاسلام کے بیچ میں مسلمانوں کے شہروں میں سے کوئی شہر واقع نہ ہو۔

[سوم یہ کہ، اس میں کوئی مسلمان اور ذمی، پہلے امن (مسلمانوں کے دیئے ہوئے معاہدہ کے مطابق) محفوظ اور مطمئن نہ ہو۔

پس یہ شرطیں اس لئے مقرر کی گئی ہیں، تاکہ (غیر اسلامی قوت و غلبہ) کی مکمل و اصل حیثیت معلوم ہو جائے۔ کیوں کہ دارالاسلام کے ان دونوں (پہلوؤں) سے جڑنے میں احتیاط کی جاتی ہے۔

طحطاوی کے حاشیہ در مختار میں، یہ ہے کہ (فقہاء کا قول) شرک کے احکامات برملا جاری ہوں، اور ان میں کوئی حکم اہل اسلام (کے اصول اور شریعت) کے مطابق، (یا اس کی روشنی میں) نہ ہو۔

ہندیہ (فتاوی عالمگیری) میں ہے اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ، اگر اس میں مسلمانوں کے احکامات (و قوانین) جاری ہوں، اور اہل شرک کے (قوانین و ہدایات) جاری نہ ہوں، تو وہ دارالحرب نہیں ہوگا۔

toobaa-elibrary.blogspot.com

پس یہ شہر امام صاحب کی رائے کے مطابق نہ صاحبین کی رائے پر دار الحرب تسلیم ہوں گے، کیوں کہ (دار الحرب ہونے کے لیے) احکام اسلام کا بالکل ختم ہونا شرط ہے، جس پر سب کا اتفاق معلوم ہوتا ہے، اور اس شرط کا (اس وقت) موجود نہ ہونا ظاہر ہے۔ کیوں کہ ان علاقوں میں (مسلمان بادشاہوں کی ہدایت و قانون کے مطابق) بہت سے اسلامی ہدایت و احکامات اب بھی (قانوناً) باقی اور جاری ہیں۔

اور اگر یہ شہر صاحبین کی رائے کے مطابق دار الحرب ہوں تو ان شہروں میں غیر مسلموں سے سود لینے و کافروں سے رہن لینے کا کیا حکم ہوگا؟ اور ان دونوں کا شریعت کے قانون کے مطابق جو مقصد ہو تحریر فرمائیں۔

اور دار الحرب کے دار الاسلام میں بدل جانے کی صورت میں صرف چند اسلامی احکامات کا نافذ ہونا کافی ہو، تو بظاہر اس زمانہ میں پوری دنیا دار الاسلام ہوگی؟

والسلام خیر ختام

بعد آداب ضلع مظفر

۱۷ شعبان ۱۳۱۰ھ (۷ مارچ ۱۸۹۳ء)

toobaa-elibrary.blogspot.com

ہندوستان کی شرعی حیثیت کیا ہے......؟

ترجمہ فتویٰ [یا مکتوب گرامی] حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ

ترجمہ از نور الحسن راشد کاندھلوی

بندہ رشید احمد گنگوہی کی جانب سے

میرے کرم فرما مولوی سعید الدین صاحب آپ کی عنایت ہمیشہ باقی رہے۔ بعد سلام مسنون واضح ہو کہ ماہ رمضان المبارک میں آپ کا خط مسئلہ دار الحرب کی تحقیق کے لئے پہنچا تھا، چونکہ میری صحت ایک عرصہ سے کمزور چلی رہی ہے، اور رمضان المبارک میں اس میں اضافہ ہو گیا تھا، اس لئے جواب نہ دے سکا، اب اس وقت جیسے بھی بن پڑے جواب لکھتا ہوں۔

سنئے! کسی شہر (یا کسی ملک) کے دار الاسلام یا دار الحرب ہونے کا دار و مدار، مسلمانوں کے غلبہ (قوت قاہرہ) یا کافروں کے غلبہ پر ہے، اور بس! لہٰذا ہر وہ جگہ جو مسلمانوں کے احکامات کے تابع ہے، اس کو دار الاسلام کہا جائے گا، اور ہر وہ جگہ جو کافروں کے احکامات کی پابند ہے، اس کو دار الحرب کا نام دیا جائے گا۔ جامع الرموز میں کہا ہے

دار الاسلام وہ ہے جس میں امام المسلمین کے احکامات جاری ہوں، اور وہاں مسلمان امن کے ساتھ رہتے ہوں۔ اور دار الحرب وہ ہے، جس میں مسلمان غیر مسلموں سے خوف زدہ رہتے ہوں۔

رد المحتار اور شامی میں ہے۔

"قدری سے یہ دریائے شور کے متعلق سوال کیا گیا، کہ وہ دار الحرب ہے یا دار الاسلام؟ جواب دیا کہ وہ ان دونوں سے جدا ہے، اس لئے کہ اس میں کسی کو بھی غلبہ حاصل نہیں ہے۔

اس عبارت کے نقل کرنے کا مقصد یہ ہے کہ، کسی مقام کے دار الاسلام یا دار الکفر ہونے کا مدار اہل کفر اور اہل اسلام کے غلبہ پر ہے، اور بس! اگرچہ دیگر وجوہات کی بنا پر دریائے شور کے متعلق، ورنہ تو اس کے دار الحرب ہونے کا ہوگا۔ اور ہر وہ جگہ جو دونوں فریق کی مقہور ہو، اس کو۔

الاسلام یعلو ولا یعلیٰ۔

اسلام غالب رہتا ہے مغلوب نہیں ہوتا۔

کے اصول کے مطابق دارالاسلام نہیں ہے، مگر اسی شرط پر کہ یہاں بعض پہلوؤں سے بھی اسلام کا غلبہ اور تسلط ہو، نہ صرف یہ کہ وہاں مسلمان رہتے ہوں، یا بعض شعائر اسلام کی کفار کی اجازت سے بجا آوری کی اجازت ہو، اس لئے کہ کسی خطے میں مسلمانوں کا آباد ہونا یا وہاں غیر مسلموں کی اجازت سے شعائر اسلام کی بجا آوری کی اجازت ہونا، قابل اعتبار نہیں ہے۔

اسی طرح غیر مسلموں کا دارالاسلام میں (موجود) ہونا، اور وہاں کفریہ رسومات پر اہل اسلام کی اجازت یا ان کی کوتاہی وغفلت کی وجہ سے عمل پیرا ہونا، اس خطے کے دارالاسلام ہونے کو کچھ نقصان نہیں پہنچاتا۔ کیونکہ دونوں میں سے کسی صورت میں بھی (دوسرے فریق کا) غلبہ نہیں ہوا، اور (دارالاسلام یا دارالحرب کا) فیصلہ غلبہ کی وجہ سے ہے، نہ صرف موجود رہنے یا احکام اسلام یا کفر عام کرنے کی وجہ سے۔

اس کی ایک مثال یہ ہے کہ ذمی دارالاسلام میں مسلمانوں کی اجازت سے قیام پذیر رہتے ہیں اور اپنے مذہبی طور طریق کو برملا انجام دیتے ہیں، اس کے باوجود (اس خطے کا) دارالاسلام ہونا، جوں کا توں باقی رہتا ہے، اور مسلمان دارالکفر میں کافروں سے معاہدہ امن کی وجہ سے اطمینان سے آتے جاتے ہیں، اور اپنے اسلامی شعائر کو دارالکفر میں بے جھجک انجام دیتے ہیں، (معاہدہ امن) اس علاقے کے دارالکفر ہونے کو ختم نہیں کرتا۔

کیا آپ ملاحظہ نہیں فرماتے کہ فخر عالم حضرت سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم ایک بہت بڑے مجمع کے ساتھ عمرۃ القضاء کے لئے مکہ معظمہ تشریف لے گئے، اور جماعت نماز وغیرہ جملہ شعائر اسلام کو وہاں عمل کر دکھاتے تھے، اور باوجود اس قدر وسیع جماعت کی موجودگی کے، کہ اس کے ذریعے مکہ میں کافروں کو خوف زدہ فرما سکیں، چنانچہ حدیبیہ میں رفقاء کی کثیر تعداد کی بنا پر مکہ معظمہ پر غلبہ کا ارادہ فرمایا تھا، مگر کیونکہ یہ سب کافروں کی اجازت کی وجہ سے تھا، اس لئے ان تینوں دنوں کے لئے مکہ دارالاسلام نہیں ہوا، بلکہ دارالحرب ہی رہا۔ کیونکہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا وہاں پہ قیام اور ظہور شعائر اسلام کا فریق مخالف کی اجازت سے تھا، مسلمانوں کے اپنے غلبہ اور طاقت کی وجہ سے نہیں۔

بہرحال یہ طریقہ خوب ہے اور ایک قاعدہ کلیہ ہے، کہ دارالحرب، کافروں کے زیر تسلط علاقہ ہے اور دارالاسلام مسلمانوں کے تابع فرمان مملکت ہے۔ اگرچہ ایک ہی علاقے میں دونوں فریق کے افراد بھی، بلا کسی ظلم و زیادتی کے، آزادی سے رہتے ہوں، اور جس مقام پر دونوں فریقوں میں مسلمانوں کو قیادت و قوت حاکمہ حاصل ہو، وہ بھی دارالاسلام سمجھا جائے گا۔

ان اصول کو خوب ذہن نشین کر لینا چاہئے، کیونکہ اس موضوع کے جملہ مسائل اسی سے نکلتے ہیں، اور اس باب کی تمام جزئیات اسی اصول کے تابع ہیں۔ اس کے علاوہ ایک بات ذہن نشین کیجئے، کہ ہر وہ جگہ جو دارالکفر ہو اور اہل اسلام اس پر اقتدار حاصل کر لیں، اور وہاں احکام اسلام جاری کر دیں، اس کے متعلق علماء بھی فرماتے ہیں، کہ وہ دارالاسلام

toobaa-elibrary.blogspot.com

ہوگیا، کیوں کہ مسلمانوں کا اقتدار اور تسلط نافذ ہوگیا ہے۔ اگرچہ بعض صورتوں میں وہاں کافروں کا عروج و اقتدار باقی ہو مگر پھر بھی [الاسلام یعلو ولا یعلی] اسلام غالب رہتا ہے، مغلوب نہیں ہوتا، کے اصول کے مطابق، وہ خطہ باتفاق علمائے اسلام دار اسلام ہوگئی ہے، جیسا کہ اوپر وضاحت کردی گئی۔

مکرر وضاحت کی جاتی ہے کہ، اگر اس خطے میں مسلمانوں کا داخلہ اور اسلام کا ظہور، مسلمانوں کے تسلط اور اقتدار کے ذریعے نہ ہوا ہو، تو اس علاقے کے دار الحرب ہونے کے حکم میں، کوئی تبدیلی نہیں آئے گی۔ ورنہ اس طرح صرف (مسلمانوں کی موجودگی سے) تو جرمن، روس ( ) فرانس وغیرہ عیسائیوں کی تمام حکومتیں، اور چین وغیرہ کافروں کے ملک دار الاسلام ہوجائیں گے، اور دنیا میں بھی کہیں دار الحرب کا نام و نشان باقی نہیں رہے گا۔ اس لئے تمام غیر مسلم ملکوں میں مسلمان غیر مسلم حکومتوں کی اجازت سے، احکام اسلام پر عمل پیرا رہتے ہیں، اور ایسے ملکوں کو دار الاسلام کہنا بدیہی طور پر غلط ہے۔

بہر صورت دار الاسلام اور دار الکفر کی تعیین میں، تسلط اور اقتدار معتبر ہے، اور بس! اور ہر وہ جگہ جو دار الاسلام تھی پھر غیر مسلموں نے وہاں تسلط حاصل کرلیا تو اگر وہاں اسلام کا حکم اور اقتدار بالکل ختم ہوگیا ہو، تو وہ علاقہ دار الحرب ہوجائیگا، اور اگر کافروں کا تسلط ہو، لیکن بعض حیثیت سے مسلمانوں کو بھی غلبہ و اقتدار حاصل ہو، اس کو دار الاسلام کہیں گے۔ نہ کہ دار الحرب۔ اس مسئلہ پر اتفاق ہے، مگر غلبہ اقتدار بالکل ختم ہونے کی کیا حد ہے، اس میں ہمارے ائمہ فقہ کے درمیان اختلاف ہے۔

صاحبین فرماتے ہیں، کہ اگر دونوں فریق (اہل اسلام اور غیر مسلم) اپنے اپنے احکامات اور فیصلوں کو علی الاعلان جاری کرسکتے ہوں، تو غلبہ اسلام بھی باقی ہے، اور اگر اہل اسلام اپنے احکامات کے نفاذ کی طاقت نہ رکھتے ہوں اور اس میں غیر مسلموں کی اجازت کے پابند ہوں، تو کچھ بھی غلبہ اسلام باقی نہیں رہا (یعنی یہ ملک دار الحرب شمار ہوگا)۔

کیوں کہ جب کافر اس طرح مسلط ہوگئے، کہ کافرانہ احکامات پورے طور اور طاقت سے جاری کرنے لگے اور اہل اسلام اس قدر عاجز اور مغلوب ہوگئے، کہ اسلامی احکامات نافذ نہیں کرسکتے، اور کافرانہ احکامات جو اہل اسلام کے لئے موجب شرمندگی اور عیب ہیں، ان کو ختم کرنے اور رفع کرنے کی طاقت نہیں رکھتے، پس اسلام کا غلبہ کس درجہ میں باقی رہا، کہ (اب بھی) اس کو دار الاسلام کہا جائے؟ بلکہ کفار کا تسلط و اقتدار پوری طرح ظاہر ہوگیا، اس لئے (وہ) اس وقت دار الحرب ہوگیا ہے۔ اس کے بعد جو کچھ ہوگا سو ہوگا، اس وقت اس کے دار الحرب ہونے میں کوئی کمی باقی نہیں رہی، اور یہ اس دار الحرب کی طرح ہوگیا، جس پر پرانے زمانے سے کافر مسلط ہیں، جیسا کہ ظاہر ہے۔

( ) یاد رہے کہ حضرت مولانا گنگوہی کا یہ فتویٰ شوال سنہ ۱۳۱۰ھ اپریل ۱۸۹۳ء کا لکھا ہوا ہے۔ اس وقت روس میں بادشاہت تھی، عیسائی حکومت تھی اور رومانوف کی حکمرانی تھی، اس کے پچیس سال بعد سنہ ۱۹۱۷ء میں کمیونسٹ انقلاب آیا تھا۔ (انور)

اور امام ابو حنیفہ نے بدائع میں ابن رستم کے طریق سے روایت کیا ہے کہ دار الاسلام کو دار الکفر قرار دینے میں اس وقت تک احتیاط کرنی چاہیے، جب تک کہ اسلام کے شعائر میں سے کچھ بھی باقی ہو، یا کافروں کے قبضے اور تسلط میں کچھ کمزوری پائی جاتی ہو، اور ان کے تسلط (دارالحرب) کو دارنا مسلمانوں پر زیادہ مستقل نہ ہو، مگر اس پر دو شرطیں اور اضافہ فرمائی ہیں۔

یہ کہ وہ شہر اور بستی، جس پر کفار قابض اور متسلط ہیں، دار الحرب سے اس طرح ملا ہوا ہو کہ اس کے اور دار الحرب کے درمیان دار الاسلام کا کوئی علاقہ اس طرح حائل نہ ہو کہ اس علاقے کو دار الحرب سے متصل کی وجہ سے اس کو دار الاسلام سے دوری ہو جائے، وہ کافروں کے حلقے میں آ جائے۔ نیز کافروں کا غلبہ اس مضبوطی کے ساتھ ہو کہ اس کو کافروں کے ہاتھ سے خالی کرانا سخت دشوار ہو جائے، اور اس مقام کے رہنے والے مسلمانوں پر کافروں کا تسلط مکمل کر پہنچ جائے، اور اس کی مثال یہ ہے کہ جیسے کفار مسلمانوں کے مال پر قبضہ کر لیں، اگر وہ مال ان (کافروں کے ملک یا علاقے) میں پہنچ گیا، تو ان کی ملکیت ہو گیا، اور اگر اس قبضے کے بعد (بھی) ان کے خاص علاقے میں نہیں گیا، تو اس کو اصل مالک کی ملکیت سے نکل جانا تسلیم نہیں کیا جاتا، جیسا کہ فقہ کی تمام کتابوں میں یہ مسئلہ طے شدہ (واضح) ہے۔ ہدایہ میں کہا ہے

اور جب (غیر مسلم) ہمارے مال پر قابض ہو جائیں اور ان کو اپنے علاقے میں لے جائیں، تو وہ اس کے مالک ہو جائیں گے۔

اسی ہدایہ میں یہ بھی ہے

لیکن یہ قبضہ تسلیم نہیں ہوتا، جب تک وہ اس کو اپنے علاقے میں نہ لے جائیں، کیونکہ قبضہ کا حاصل یہ ہے کہ اس چیز پر اس وقت بھی قبضہ ہو اور وہ قبضہ آئندہ بھی باقی رہ سکے، پس اسی صورت کوئی زمین یا علاقہ اگر کافروں کے تسلط میں آ گیا، مگر ان کا یہ قبضہ اور تسلط پورا مکمل ہو گیا کہ وہ شہر یا علاقہ بلاد کفر میں مل گیا، اور یہ قبضہ اس زمین کے دار الحرب سے علاقائی طور پر بھی ایک ہو گیا اور دار الکفر سے مل گیا اور دار الاسلام سے کٹ گیا، تو گویا یہ شہر غیر مسلموں کے ہاتھوں میں مکمل آ گیا، وہ بہ حیثیت گویا تو یہ دار الحرب ہے، ورنہ دار الاسلام باقی ہے۔

غرض اس کا ... احتمال غالب ہو کہ الاسلام یعلو ولا یعلی (اسلام سر بلند رہتا ہے، پست اور کمزور نہیں ہوتا) کی حدیث کے مطابق یہ دار الاسلام ہونا چاہیے، اس شرط کا حاصل بھی وہی بلاد کفر کا غالب ہونا اور بلاد اسلام کا مغلوب ہونا ہے، جو شروع میں بنیادی اصول اور کلیہ بیان کیا گیا ہے۔

(۲) دوسری شرط یہ ہے کہ امن جو مسلمان کو حاصل ہے مسلمانوں کو ان کے مسلمان ہونے کی وجہ سے، اور غیر مسلم

toobaa-elibrary.blogspot.com

رعایا کو ذمی کے معاہدہ کی وجہ سے دی تھی ختم ہو جائے اس طرح ختم ہو جائے کہ کسی بھی شخص کو اپنے مال و عزت کی حفاظت کا اطمینان باقی نہ رہے۔ یعنی جیسے کہ مسلمان حاکم کے امن دینے (اعلان کرنے) کی وجہ سے ہمیشہ محفوظ سمجھتے کہ حاکم کے امن کی وجہ سے یہ خیال نہیں کہ کسی مسلمان یا ذمی کی جان یا مال کو کوئی خطرہ ہوگا، یہ خطرہ اسی وقت ہو سکتا ہے، جب مسلمان حاکم کو شوکت اور غلبہ حاصل نہ ہو، جب یہ امان باقی نہ رہی کہ کوئی شخص بھی اس امان کی وجہ سے محفوظ نہ رہا، یعنی یہ امان بے وقعت اور بے اثر ہوگئی اور جو امان کہ غیر مسلموں نے دی ہے، وہی امن پر اطمینان کا ذریعہ ہے۔

پس ظاہر ہے کہ جب تک مسلم حاکم کے ڈر کی وجہ سے تکلیف پہنچانے والے کو ڈر رہے گا، تو مسلمانوں کے امن کا غلبہ اور اس کی شوکت (کسی قدر) باقی رہے گی، اور جب یہ چیز نہ رہے گی بلکہ (مسلمان حاکم کا دیا ہوا) امن کمزور ہو جائے گا، پہلا (اسلامی) امان ختم ہو جائے گا۔

لہذا حضرت امام ابو حنیفہ کے نزدیک، جب کسی علاقہ میں کافروں کے علی الاعلان احکامات جاری ہونے کے علاوہ یہ دونوں شرطیں پائی جائیں گی، کفر کا ہر پہلو سے غالب ہونا ثابت ہو جائے گا، اور اسلام کا ہر پہلو سے غلبہ ختم ہو جائے گا، اس وقت آزادی میں سے کچھ باقی نہیں رہا، لہذا اس علاقہ کے دار الحرب ہونے کا حکم دیا جائے گا۔

اہل دانش کو اس سے یہ بھی معلوم ہوگا کہ اس بات کا مدار بھی قہر و غلبہ پر ہے، اور بس جو کہ شروع میں اصل کلی میں واضح کر دیا ہے۔

اس تقریر کے بعد روایات فقہیہ کو سننا چاہیے، کہ ان میں سے بعض کے نقل کرنے سے اس ناچیز کی تقریر کی سند حاصل ہو جائے گی، اور بعض کے معلوم ہونے سے اس مسئلہ کی تمام روایتیں معلوم ہو جائیں گی۔

فتاوی عالمگیریہ میں لکھا ہے کہ امام محمد نے زیادات میں فرمایا ہے

بلاشبہ امام ابو حنیفہ کے نزدیک تین شرطوں کے پائے جانے سے دار الاسلام دار الحرب ہو جاتا ہے۔

اول یہ کہ عام طور سے علی الاعلان کفر کے احکامات جاری ہو جائیں، اور اس میں اسلام کے مطابق کوئی قانون و ضابطہ (جاری اور) زیر عمل نہ ہو۔

دوسرے یہ کہ وہ اس طرح دار الحرب سے ملا ہوا ہو، کہ ان دونوں کے بیچ میں دار الاسلام میں سے کوئی بستی اور شہر واقع نہ ہو۔

تیسرے یہ کہ اس علاقہ میں کوئی مسلمان اور ذمی پہلے معاہدہ اور امان کے مطابق محفوظ و مامون نہ رہا ہو، اس

معاہدہ کے مطابق، جو (اس علاقہ پر) کافروں کے غلبہ سے پہلے، مسلمانوں کو مسلمان ہونے کی وجہ سے اور ذمیوں کو عہد و پیمان کی وجہ سے حاصل تھا۔ اب مسئلہ کی ترتیب تین طرح سے ہے:

الف: حربی ہمارے شہروں میں سے کسی شہر پر غالب آ جائیں۔

ب: اہل شہر اپنے دین سے پھر جائیں، اور اس شہر میں اہل کفر غالب ہو جائیں، اور ان کے احکامات جاری ہو جائیں اور ان ہی کا غلبہ ہو جائے۔

ج: یا اہل ذمہ اپنے معاہدہ کو توڑ دیں، اور ہمارے شہروں پر غالب ہو جائیں۔

تو ان تمام صورتوں میں سے کسی ایک شکل، یا تمام (معاملات پائے جانے کے بعد بھی) یہ شہر دار الحرب نہیں ہوں گے، مگر تین شرائط کے ساتھ: امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ نے فرمایا ہے، کہ صرف ایک شرط کے ساتھ، اس کے علاوہ کوئی شرط نہیں ہے، وہ احکام کفر کا ظاہر و غالب [نافذ] ہونا ہے، اس کے علاوہ کچھ نہیں، اور یہی قیاس بھی ہے۔

جامع الرموز میں کہا ہے: اور اس (دار الاسلام) کا دار الحرب ہو جانا (امام ابو حنیفہؒ) کے نزدیک چند شرائط کے ساتھ ہے۔

ایک کھل کر برملا احکامات کفر کا جاری ہونا، ایسا کہ حاکم کافر کی طرف رجوع کرنا ہو اور مسلمان قاضی سے کوئی معاملہ نہ ہو [جیسا کہ بحر الرائق میں ہے]۔

دوسرے اس کا دار الحرب سے، اس طرح ملا ہوا ہونا، کہ ان دونوں دار الحرب اور دار الاسلام کے شہروں کے بیچ میں کوئی اور ایسا اسلامی شہر واقع نہ ہو، جو دار الاسلام کو دشمنوں کے حملے سے بچائے اور حفاظت کرے۔

جامع الرموز کی اس عبارت سے دو باتیں واضح ہوئیں:

﴿الف﴾ ایک تو یہ کہ اہل اسلام کا حکم جاری ہونے کا مطلب اظہار حکم اسلام ہے، غلبہ کے طور پر، نہ صرف جماعت اور جمعہ [وغیرہ] کی اجازت ہونا۔ کیوں کہ مصنف جامع الرموز کہتا ہے: کہ غیر مسلموں کے احکامات کے مطابق فیصلے کیے جائیں اور مسلمان قاضیوں کی جانب رجوع نہ کیا جائے، یعنی مسلمان قاضیوں کی کچھ شوکت اور وقعت باقی نہ رہے، کہ ان سے رجوع کیا جائے۔ اور اسی طرح مسلمانوں کے لئے دار الحرب میں حکم جاری ہونے کا مطلب، ان کے حکم کا غلبہ ہونا مراد ہے، جیسا کہ ظاہر ہے۔ بہر حال حکم اسلام ظاہر ہونے اور حکم کفر ظاہر ہونے سے مراد قوت اور غلبہ ہے۔ نہ صرف [بعض معاملات کے] ادا کرنے کی اجازت، اور ان کے ظاہر کرنے کی گنجائش پر، یہ فیصلہ نہ ہوگا۔

﴿ب﴾ یہ کہ اتصال اور انقطاع کی شرط کا حاصل بھی، وہی قوت ہے کہ جس کی وجہ سے دار الحرب کے اتصال کی

toobaa-elibrary.blogspot.com

صورت میں، حربیوں سے مغلوب شہر کو مدد نہ پہنچے۔ بخلاف دارالحرب سے انقطاع کے (کہ اس وقت اہل اسلام سے) مدد کا پہنچنا ہو سکتا ہے، پس (گویا) ابھی قوت اسلام باقی ہے۔

خزانة المفتین میں ہے، دارالاسلام دارالحرب میں (تبدیل) نہ ہوگا، مگر اس میں شرک کے احکام جاری ہونے کی وجہ سے، اور اس وجہ سے کہ وہ (دارالاسلام) دارالحرب سے، اس طرح مل جائے، کہ اس دارالاسلام اور دارالحرب کے بیچ میں مسلمانوں کا کوئی شہر واقع نہ ہو، اور اس میں کوئی مسلمان اور ذمی امان اول (جو پہلے حاکم مسلم سے حاصل تھا) کے ذریعہ محفوظ اور پرامن نہ ہو۔ پس جب تک یہ شرائط نہ پائی جائیں اس وقت تک دارالاسلام دارالحرب میں (تبدیل) نہ ہوگا۔

اور ہمارے ان الفاظ: لایبقی فیھا مسلم أو ذمی آمنا بالأمان الأول کا مطلب یہ ہے، کہ اس علاقہ میں کوئی مسلمان اور ذمی، اپنی جگہ محفوظ نہ ہو، مگر مشرکین کے دیئے ہوئے امن و امان کی بنیاد پر۔

اور بزازیہ میں ہے سید الامام ( ) نے فرمایا: وہ شہر اور علاقہ جو کافروں کے ہاتھوں میں ہے، اس میں شک نہیں کہ وہ بلاد اسلام ہے، کیوں کہ اس میں کافروں کے احکامات نافذ نہیں، بلکہ مسلمان قاضیوں کے احکامات پر عمل ہے۔

پس دیکھنا چاہئے کہ، ان شہروں کے دارالاسلام ہونے کے ثبوت میں، یہ لائے ہیں: بل القضاة مسلمون یعنی وہاں ان قاضیوں کی ہدایات اور اسلام کے احکامات، اسی طرح نافذ ہیں، جس طرح شروع میں تھے۔ یہ نہیں کہا کہ وہ اس لئے دارالاسلام ہیں، کہ وہاں لوگ نماز پڑھتے ہیں اور جمعہ کی نماز (جماعت سے) ادا کرتے ہیں۔ کیوں کہ اجرائے احکام سے شوکت و غلبہ مراد ہے، نہ سرکاری ملازمین و حکام کی اجازت سے، مراسم دین کی ادائیگی۔

درمختار میں کہا ہے۔

معراج الدرایہ میں مبسوط سے نقل کیا ہے کہ: وہ شہر جو کافروں کے تسلط میں ہیں، وہ بلاد اسلام ہیں، دارالحرب نہیں ہیں، کیوں کہ ان میں کفر کے احکامات ظاہر نہیں ہوئے، بلکہ وہاں [بدستور] قاضی اور مسلمان حکام ہیں، لوگ اپنی ضرورتوں اور اس کے علاوہ معاملات میں بھی، ان ہی کی اطاعت کرتے ہیں۔ اور ہر وہ شہر جس میں حربیوں کی طرف سے حاکم مقرر ہوں، وہاں حاکم مسلم کے لئے جمعہ و عیدین قائم کرانا اور اجراء حد اور قاضی کا تقرر جائز ہے۔ ان حربیوں پر بھاری پڑنے کی وجہ سے۔ پس اگر حاکم غیر مسلم بھی ہوں، تو مسلمانوں کے لئے جمعہ قائم کرنا جائز ہے اور قاضی مسلمانوں کے مقرر کرنے سے قاضی ہو جاتا ہے، اور مسلمانوں کے لئے واجب ہے، کہ وہ مسلم حاکم کے لئے کوشش کریں۔

اور اسی (درمختار) میں ہے۔ میں کہتا ہوں، اور اس سے یہ بھی ظاہر ہوا کہ ملک شام میں، جبل تیم اللہ اور اس سے ملحق بعض علاقے سب بلاد اسلام ہیں، کیوں کہ اگرچہ ان شہروں کے حاکم دروز اور نصاری ہوتے ہیں، اور ان کے فیصلے اپنے مذہب کے مطابق ہوتے ہیں، اور ان میں سے کچھ علی الاعلان اسلام کو برا بھلا کہتے ہیں، لیکن وہ (عموماً مجموعی طور پر) ہمارے حکام کی ماتحتی میں ہیں، اور اسلامی شہران کی بستیوں کا، ہر طرف سے احاطہ کئے ہوئے ہیں، اور مسلم حکام جب ان کے متعلق، اپنے احکامات نافذ کرنا چاہیں، کر سکتے ہیں۔

ان دونوں روایتوں سے واضح ہے، کہ کسی علاقہ پر کافروں کے غلبہ کے بعد، اس کا دارالاسلام کی حیثیت سے باقی رہنا، وہاں مسلمان حکام کی قوت و شوکت کا باقی رہنا، اور اسلامی قوانین اور احکامات کا غلبہ اور قوت کے ساتھ نافذ ہونا، مراد ہوتا ہے۔ اسی طرح اگر دار حرب میں، اسلامی احکام اگر قوت (و طاقت) سے جاری ہوں، تو یہ اس کے دار حرب ہونے کو ختم کرنے والا ہوگا، صرف ان غیر مسلموں کے مخالف اسلام، حاکم کی اجازت اور خوشنودی سے، شعائر اسلام کے ادا کرنے کی اجازت سے، دار اسلام نہ ہوگا۔

حاصل یہ کہ مقصد ان شروط مذکورہ بالا سے، امام صاحب کے نزدیک اور شرط واحد اجراء حکم اسلام سے، صاحبین کے نزدیک وہی اہل اسلام کا غلبہ اور قوت و شوکت ہے، اگرچہ یہ قوت و شوکت جزوی طور پر ہو۔ کوئی فقیہ نہیں فرماتے کہ کافروں کے ملک میں، اگر کوئی شخص ان (کافروں) کی صراحۃً یا دلالۃً اجازت سے، شعائر اسلام ظاہر کرتا ہے، [ان پر عمل کرتا ہے] تو اس سے وہ ملک دارالاسلام ہو جاتا ہے، ہرگز نہیں! اس لئے یہ بات فقہ و تفقہ سے دور ہے۔

جب یہ مسئلہ واضح ہو گیا، اب ہندوستان کے حال پر غور فرمائیں، کہ یہاں کافروں اور عیسائیوں کے احکامات کس قوت اور غلبہ کے ساتھ ہیں! اگر ادنیٰ کلکٹر بھی حکم دیدے، کہ مسجدوں میں جماعت کی نماز ادا نہ کریں، کوئی شخص غریب امیر اس کی ہمت نہیں رکھتا، کہ نماز ادا کر سکے۔ اور یہ جمعہ اور عیدین کی نمازوں کا ادا ہونا اور فقہی طور پر، ان کی ادائیگی کا حکم ہو جانا، صرف ان (انگریزوں وغیرہ) کے قانون کی وجہ سے ہے، کہ انہوں نے رعایا کے لئے یہ حکم جاری کر رکھا ہے، کہ ہر شخص اپنے دین کے مطابق عمل کرے، سرکار کو اس سے کچھ لینا دینا نہیں، اور سلاطین اسلام کا دیا ہوا، جو امن تھا، اس کا تو اب نام و نشان بھی باقی نہیں۔ کون عقل مند اس کو مانتا ہوگا کہ وہ امن (اور اجازت) جو شاہ عالم نے دیا تھا، ہم اب بھی اس معاہدۂ امن کے تحت آرام سے بیٹھے ہیں، بلکہ یہ (ایک) نیا ضابطہ امن ہے، جو کافروں سے حاصل ہوا ہے، اور اسی امن (و انتظام) کے تحت، تمام قومیں ہندوستان میں قیام پذیر ہیں۔

جہاں تک [ایسے علاقے کا] دارالاسلام سے ملے ہوئے ہونے کا تعلق ہے، تو یہ ملکوں اور بڑے علاقوں میں شرط نہیں،

toobaa-elibrary.blogspot.com

بلکہ چھوٹی بستیوں اور شہروں کے لئے یہ شرط کی گئی ہے۔ اور مدد ملنے سے سہولت سے مدد ملنا مراد ہے، اور کون کہہ سکتا ہے کہ اگر کابل کے حکمران کی یا خلیفہ مسلمین [ترکی] کی مدد آجائے تو مسلمان کافروں کو ہند سے نکالدیں گے۔ ہرگز نہیں۔ بلکہ ان کا نکال دینا بہت دشوار ہے، مستقل جہاد و جنگ، اور بہت سامان (وانتظامات) کو چاہتا ہے۔ بہر حال کافروں کا ہندوستان پر تسلط اس درجہ کا ہے کہ، کسی وقت بھی کافروں کو دار حرب پر، اس سے زیادہ تسلط (اور قبضہ) نہیں ہوا [جیسا یہاں ہے] اور یہاں مراسم اسلام کا ادا کرنا، صرف ان کی اجازت سے ہے، اور (ہندوستان میں) مسلمانوں سے زیادہ کمزور بے بس، ان کی رعایا میں کوئی نہیں ہے، کہ ہندوؤں کو بھی کسی قدر اعتبار حاصل ہے، مگر مسلمانوں کی کچھ وقعت نہیں ہے، ہاں البتہ ٹونک، رامپور اور بھوپال وغیرہ میں، کہ وہاں کے حاکم [نواب] کافروں کے احکامات سے دبے ہوئے ہونے کے باوجود، اپنے احکامات جاری رکھتے ہیں۔ اس لئے ان ریاستوں اور مقامات کو، دارالاسلام کہا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ، ردمختار وغیرہ کی روایتوں سے معلوم ہوتا ہے۔

اب بعد سلام مسنون! یہ ہے کہ، اگر اس تحریر سے آپ کو اطمینان حاصل ہو جائے، تو مراد حاصل ہے، ورنہ بندہ کو معذور سمجھیں۔ چوں کہ میں لمبی تحریر سے معذور ہوں، (اس لئے) اسی مسودہ کو (آپ کے پاس) بھیجتا ہوں، امید کہ نقل کے بعد اس کو (واپس) بھیج دیں گے، کیوں کہ بعض لوگ یہاں بھی اس کی نقل کا ارادہ رکھتے ہیں۔

فقط والسلام

۷ر شوال ۱۳۱۰ھ (۲۴ر اپریل ۱۸۹۳ء)

toobaa-elibrary.blogspot.com